جلد۲ شمارہ ۲

اپریل تا جون ۲۰۰۲

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

سرمایہ دارانہ طریقہ زراعت: استحصال کے ''جدید'' طریقے

آجکل ملک میں سرمایہ دارانہ طریقہ زراعت یا ''کارپوریٹ فارمنگ'' کا چرچہ زوروں پر ہے۔حکومت نے حال ہی میں کارپوریٹ آرڈیننس پاس کر کے کھلے عام اعتراف کرلیا ہے کہ اس کی تمام تر ہمدردیاں سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک اوران کی بین الاقوامی کمپنیوں کے ساتھ ہیں۔دوسرے الفاظ میں حکومت نے بالآخر زراعت کے حوالے سے عالمی مالیاتی اداروں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔حکومت کی پالیسیوں میں بنیادی تضاد پایا جاتا ہے۔ایک طرف حکومت، تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ ملکر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے زراعتی معاہدے میں ڈیولپمنٹ باکس جیسی تجاویز پیش کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہی ہے کہ اسے سرمایہ دارانہ زراعت کے منفی اثرات اور تحفظ خوراک کی سنگینی کا مکمل احساس ہے تو دوسری طرف کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس کے اجراء سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت، عوام اور چھوٹے کسانوں کے مفادات کو آزادتجارت کے شکنجے میں جکڑنے پر کمربستہ نظر آتی ہے۔

اب جب کہ یہ آرڈیننس پاس ہو چکا ہے تو رائے عامہ کا نئے طریقہ زراعت سے پہنچنے والے سنگین اثرات سے باخبر ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی فیصلہ کبھی حتمی نہیں ہوتا، یقیناً یہ اختیار عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ ریاست کی طرف سے کیے جانے والے ضرر رساں فیصلوں کو ذمہ دار شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق کو استعمال کرتے ہوئے تبدیل یا رد کردیں۔ ایسے باوقار فیصلہ کرنے کی جسارت انہی قوموں کو نصیب ہوتے ہیں جن کی ریاست غلامی کے چنگل سے آزاد ہوں، پاکستانی ریاست شاید ابھی تک اس گرفت سے باہر نہیں آسکی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہماری حکومت یکے بعد دیگرے ایسے فیصلے کرنے پر مجبور ہے جو عوامی امنگوں کے برعکس ہے۔

حکومت نے زرعی شعبہ کے حوالے سے نہایت مایوس کن بجٹ پاس کر کے عوام کے لیے ایسے کٹھن راستوں پر گامزن ہونے کا بندوبست کیا ہے جن پر چل کر بھوک وافلاس میں کئی گنا اضافہ کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک، دوسری عالمی خوراک کانفرنس میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ دنیا سے بھوک کے خاتمے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔خاص طور پر امریکہ آزاد تجارت کے قوائد وضوابط کے عین مطابق خوراک کو ایک شئے کی صورت میں دیکھتے ہوئے منڈی کی طے شدہ قیمتوں پر بیچنے پر پختہ یقین رکھتا ہے۔یقیناً اس سوچ کے پیچھے امریکہ اور مختلف سرمایہ دار ممالک کا صرف ایک ہی مقصد ہے یعنی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کو عالمی منڈی میں مستحکم کر کے ترقی پزیر ممالک کو خوراک کے حصول کے لیے اپنا محتاج بنانا۔

ایک طرف عالمی زراعتی معاہدہ، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی پالیسیاں تیسری دنیا کی زراعت اور کسانوں کو شدید نقصان پہنچا رہی ہیں تو دوسری طرف سرمایہ دار ممالک اپنے زرعی شعبے کو بڑے پیمانے پر مراعات فراہم کررہے ہیں۔تیسری دنیا کی ریاستیں عالمی اداروں اور ترقی یافتہ ممالک کی دہری پالیسیوں کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا رہی ہیں بلکہ ان کے مرتب کردہ منفی پالیسیوں کو مزدور عوام پر نافذ کرنے کے لیے بخوشی راضی نظر آتی ہیں۔حال ہی میں اقوام متحدہ کے ادارے عالمی ادارہ خوراک وزراعت کے زیر سایہ دوسری خوراک کانفرنس میں یہ احکامات جاری کیے گئے ہیں کہ تمام ممالک بائیوٹیکنالوجی کو زرعی تحقیق وترقی کے لیے استعمال کریں۔ ہماری سرکار نے یہ فیصلہ بھی سر جھکا کر خاموشی سے قبول کرلیا ہے کہ حالانکہ یورپ جیسے ترقی یافتہ خطہ نے اس ٹیکنالوجی کے خلاف کئی قوانین وضوابط ترتیب دیے ہیں۔ سابقہ تجربات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ہماری ریاست سے مستقبل قریب میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی سے جاری ہونے والی استحصالی فیصلوں کے خلاف کسی مزاحمت کی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔

ضرورت اس امر کی کہ ہم بھی بحیثیت قوم اپنے حق خودارادیت کے حصول کے لیے یکجا ہوکر جدوجہد کا آغاز کریں اور ملک سے جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام سے نجات حاصل کر کے ایک بہتر نظام کے نفاذ کو یقینی بنائیں۔

فہرست مضامین

وفاقی بجٹ ۲۰۰۲-۲۰۰۳ 2

رخ زمانہ 13

کارپوریٹ فارمنگ اور ڈیولپمنٹ باکس 5

ہوشیار.....مضر صحت سویابین تیل ... 15

دوسری عالمی خوراک کانفرنس 8

بات تو سچ ہے مگر 11

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے ایچ بی ایف (Heinrich Boll Foundation) کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔113، بلاک 13- ڈی، گلشن اقبال، کراچی

فون، فیکس: 9267 497 21 92+ ای میل: roots@super.net.pk

فیلڈ یونٹ: پلاٹ نمبر 46 گلشن فیض-II، ٹنڈو محمد خان، فون: 42373 224 92+

وفاقی بجٹ ۲۰۰۲-۲۰۰۳: پاکستان کی دیہی آبادی اور زراعت کے حوالے سے ایک جائزہ

سرتاج خان

فوجی حکومت کے وزیرخزانہ نے ۱۵ جون، ۲۰۰۲ کو نئے مالی سال ۲۰۰۲-۲۰۰۳ کیلئے ۷۴۲ بلین☆ روپے کا وفاقی بجٹ پیش کیا۔ حسب سابق بجٹ میں عوامی فلاح و بہبود کے بجائے بیرونی قرضہ جات (۲۸۹ بلین روپے) اور دفاع (۱۶۴ بلین روپے) کو اہمیت دیتے ہوئے سرفہرست رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بجٹ کا ۶۰ فیصد صرف ان دو مقاصد کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے ۲ء۶ بلین اور صحت کے لیے ۳ء۳ بلین رکھے گئے ہیں۔ وفاقی بجٹ کو ''سرمایہ کار دوست'' قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں سرمایہ کاروں کیلئے مراعات کا اعلان کیا گیا ہے، جن میں تقریباً تمام محصولات کے بوجھ میں کمی، کارپوریشنوں اور صاحب دولت افراد پر لاگو ہونے والے انفرادی آمدنی ٹیکس میں کمی کے ساتھ دیگر اقدامات شامل ہیں۔[1]

وزیرخزانہ نے واضح کیا ہے کہ عوامی سہولیات مثلاً بجلی، تیل اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ کرنا ناگزیر ہے۔ عوامی بوجھ میں اضافہ کرنے والے اقدامات کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اول تو ملک میں وسائل کی کمی ہے اس لیے ہمیں توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بیرونی ذرائع پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اور دوئم یہ کہ حکومت کو تیل کی بین الاقوامی قیمتوں پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر قیمتوں میں اضافہ نہیں کیا گیا تو ہمیں اضافی قرضوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں: یا تو وہ لوگ اس کی قیمت ادا کریں جو آج اسے استعمال کر رہے ہیں یا پھر قرضہ لیکر اس بوجھ کو آنے والی نسلوں کو منتقل کر دیں۔

وزیرخزانہ کے توانائی کے نرخ بڑھانے کے حق میں مندرجہ بالا دلائل انتہائی کمزور اور کھوکھلے ہیں اور خود ان کی وزارت اور حکومت کے اعداد و شمار اور اقدامات ہی اسے غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں مثلاً حکومت توانائی کے ذرائع میں سے صرف تیل ہی بڑی مقدار میں درآمد کرتی ہے جبکہ بجلی اور گیس کے ذرائع ملکی سطح پر دستیاب ہیں۔ ملکی ضروریات کا ۲۵ فیصد کے قریب تیل مقامی طور پر نکالا جاتا ہے لیکن یہ بھی عوام کو عالمی نرخ پر مہیا کیا جاتا ہے۔ اگرچہ حکومت کو بین الاقوامی سطح پر تیل کی قیمتوں میں ہونے والے اتار چڑھاؤ پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں لیکن ملکی سطح پر تیل کے نرخ مقرر کرنے کے اختیارات بھی حکومت نے آئی ایم ایف کے دباؤ کے تحت ایک خود مختار ادارے کو منتقل کر دیے ہیں جس میں تیل کی تجارت سے وابستہ بین الاقوامی کمپنیاں بھی شامل ہیں۔ دوسری طرف حکومت نے آئی ایم ایف کے شرائط پورے کرتے ہوئے تیل پر عوام کو دی جانے والی چھوٹ کا خاتمہ کر دیا ہے اور ہر سال اس محصول میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے مثلاً سال ۲۰۰۰ میں یہ رقم ۳۲ بلین روپے اور اگلے مالی سال ۲۰۰۱-۲۰۰۲ میں ۳۹ بلین روپے تھی جو اب بڑھ کر ۴۵ء۵ بلین روپے ہوگئی ہے۔[2]

گیس بھی مقامی سطح پر دستیاب قدرتی وسیلہ ہے لیکن اس پر بھی عوام کو ۱۵ بلین روپے ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ توانائی کا ایک اور اہم ذریعہ بجلی ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام کے متعارف کرائے جانے سے قبل بجلی ریاستی کنٹرول میں پیدا کی جاتی تھی لیکن بعدازاں اس میں بھی بین الاقوامی اداروں کے دباؤ کے تحت نجی اور بیرونی سرمایہ کاری کی اجازت دینے کے علاوہ اس کے نرخوں میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔ عالمی اداروں کے دباؤ کے تحت حکومت کو نجی شعبے میں بجلی پیدا کرنے والے اداروں سے بجلی خریدنے کا پابند بنا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے واپڈا کو ہر سال اربوں روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے مثلاً ۱۹۹۹ اور ۲۰۰۰ میں یہ خسارہ بالترتیب ۶ء۱۵ بلین روپے اور ۲۶ بلین روپے تھا۔[3] اس کی وجہ یہ ہے کہ واپڈا ان اداروں سے مہنگے داموں بجلی خریدتا ہے جبکہ واپڈا خود کم لاگت میں بجلی پیدا کرتا ہے۔

حکومت کے ان اقدامات کا زراعت اور دیہی آبادی پر شدت سے اثر پڑتا ہے کیونکہ توانائی (انرجی) دیہی آبادی کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ کسان کی پیداواری لاگت کو متاثر کرتی ہے۔ ٹریکٹر، تھریشر اور ٹیوب ویل کے علاوہ پیداوار کو منڈی تک پہنچانا وہ عام عوامل ہیں جن سے کسان کو روزمرہ واسطہ پڑتا ہے۔ گزشتہ سال بارشوں میں کمی اور نہری پانی کی عدم موجودگی کے باعث کسانوں کو مجبوراً ٹیوب ویل پر انحصار کرنا پڑا جس سے ان کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوا اور آئندہ بھی اس بات کا امکان موجود ہے کہ کسانوں کو نہری پانی کی کمی کی وجہ سے ٹیوب ویل کے پانی کا ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ ان وجوہات کی بناء پر کسان بڑی حد تک بجلی پر انحصار کرتے ہیں۔ ان ظاہری عوامل کے علاوہ کسان کے استعمال میں آنے والی دیگر اشیاء بھی توانائی کے نرخوں کے اتار چڑھاؤ سے شدید متاثر ہوتی ہیں۔

کسان کو بہتر فصل کی کاشت کے لیے کھاد اور کیڑے مار ادویات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں بھی توانائی کے ایک یا کئی ذرائع استعمال ہوتے ہیں۔ حکومت جب بھی توانائی کے کسی بھی ذریعے میں اضافے کا اعلان کرتی ہے تو سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ادارے قیمت کے اس بوجھ کو پیداوار کی لاگت میں جمع کر کے اس کی قیمت بڑھا کر کسان سے وصول کر لیتے ہیں مثلاً کھاد کے استعمال میں گیس بڑے پیمانے پر استعمال ہوتی ہے اس لیے گیس کے نرخ میں اضافہ سے کھاد کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تیل کی قیمت میں اضافے سے کھاد کے لیے درکار خام مال کے کارخانے تک پہنچ کی قیمت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ تیار کھاد کی دکان اور وہاں سے کھیت تک پہنچ کے تمام اخراجات بھی کسان کو ہی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح جنرل سیلز ٹیکس اور توانائی کے ذرائع کی قیمتوں میں اضافہ کسان کے پیداواری

لاگت میں براہ راست اضافہ کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ کیا کسان ان پیداواری اخراجات اور اپنے منافع کو پیداوار یا فصل کی قیمت کی شکل میں وصول نہیں کرسکتا؟ ماضی میں یقیناً ایسا کرنا کسی حد تک ممکن بھی تھا لیکن آزاد تجارت کے ظہور کے بعد ایسا کرنا مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ سال ۲۰۰۴ میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے عالمی زراعتی معاہدہ کے پوری طرح لاگو ہونے کے بعد یہ امر بالکل ناممکن ہوجائے گا۔

عالمی اداروں اور طاقتوں کی طرف سے آزاد تجارت کے نفاذ سے قبل حکومتی ادارے بڑی فصلوں کے خریدار ہونے کے ساتھ کسانوں کے لیے کئی مراعات اور امداد فراہم کرتے تھے لیکن گزشتہ سال سے حکومت نے اس عمل سے مکمل طور پر ہاتھ کھینچ لیے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پورے ملک میں کسانوں کو مقرر کردہ سرکاری نرخ سے کم پر نجی شعبے کے خریداروں کو گندم فروخت کرنی پڑی ہے۔ گندم وہ فصل ہے جس کا تحفظ خوراک کے تحت ہمارے دیہاتوں میں ذخیرہ کیا جاتا رہا ہے لیکن اب یہ بھی ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسان کی معاشی حالات اتنی خراب ہوگئی ہے کہ اس کو فوری نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان حالات سے نجی شعبے نے خوب فائدہ اٹھایا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ حکومت نے نجی شعبے کو اس مقصد کے لیے نہ صرف ۶۰ بلین روپے کا قرضہ دیا بلکہ سرکاری نرخ سے کم داموں گندم کی خرید و فروخت کا تماشہ بھی دیکھتی رہی۔

کسان پیداواری لاگت سے کم پر اپنی پیداوار کئی وجوہات کی وجہ سے بیچنے پر مجبور ہیں؛ اول اس لیے کہ زمین کے مالک یا جاگیردار کو جلد از جلد حصہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسان کو تیل، آبیانہ کے علاوہ صحت اور دیگر اخراجات کے لیے نقد رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو عموماً کسان نے ساہوکاروں سے سود پر قرضہ کی شکل میں لیا ہوتا ہے اور یہ عرصہ عموماً فصل کے کٹنے تک کی مدت پر محیط ہوتا ہے۔ نئی فصل کی بوائی، کھاد اور دیگر لوازمات کے لیے بھی رقم کی ضرورت پڑتی ہے یا اگر یہ چیزیں قرضہ پر لینی ہوں تب بھی پرانا قرضہ چکا کر ہی نئی چیز حاصل کی جاسکتی ہے۔

پیداواری اخراجات بڑھنے کے نتیجے میں کسان فصل کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ قرضے کی واپسی کے نظر کردیتا ہے جبکہ باقی بچ جانے والی رقم سے گھر کے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو موجودہ حالات میں ممکن نہیں۔ نتیجتاً کسان گھرانوں کے پاس خوراک، صحت اور تعلیم جیسی اہم ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

حکومت نے اس سال بجٹ میں ۲۵۰۰ اشیاء پر عائد درآمدی ٹیکس ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جس میں زراعت کے حوالے سے اناج کی ''ترقی'' اور ذخیرہ کرنے کے لیے درکار مشینریوں اور پلانٹ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گندم پر درآمدی ٹیکس کا خاتمہ بھی کردیا گیا ہے۔ درآمدی ٹیکسوں کا خاتمہ یا کمی آزاد تجارت کا ایک اہم اصول ہے۔ کیونکہ اس کو آزاد تجارت کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے انتہائی دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گندم پر درآمدی ٹیکس کے خاتمے سے گندم کی تجارت کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے راہ کھل گئی ہے کہ وہ پاکستان میں دنیا کے دیگر ممالک مثلاً امریکہ سے درآمد شدہ اناج کے کاروبار سے منافع کمائیں۔

عالمی سطح پر تیسری دنیا کے زرعی ممالک زراعتی معاہدے (اے او اے) کے تحت اپنی زرعی منڈیوں کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی کمپنیوں کے لیے کھولنے پر مجبور ہیں۔ جس کی وجہ سے شمالی امریکہ اور یورپ کی بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں ان ممالک میں اناج کو پیداواری لاگت سے بھی کم پر فروخت کرتی ہیں جس کا مقابلہ مقامی طور پر بے آسرا چھوٹے کسان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

دراصل ان بین الاقوامی کمپنیوں کے کسی ملک میں آمد سے قبل ہی وہ تمام اقدامات تکمیل تک پہنچ چکے ہوتے ہیں جو مقامی کسان کو ہر طرف سے بے یارومددگار کرنے کے لیے ضروری تصور کیے جاتے ہیں مثلاً پاکستان میں بجلی، گیس اور تیل کے نرخوں میں مسلسل اضافہ، کھاد اور کیڑے ادویات پر جنرل سیلز ٹیکس کا نفاذ، فصلوں کے لیے امدادی قیمت اور چھوٹ کا خاتمہ، نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی انہی اقدامات کی کڑیاں ہیں۔ پاکستان اس سلسلے میں واحد ملک نہیں بھارت، فلپائن، میکسیکو، تھائی لینڈ اور انڈونیشیاء جیسے زرعی ممالک بھی انہی مراحل سے گزر رہے ہیں یا وہاں زرعی کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کا کنٹرول بڑھ رہا ہے۔ امریکہ اور یورپ کی زرعی کاروبار کرنے والی بڑی بڑی کمپنیوں کے لیے تیسری دنیا میں پیداواری لاگت سے کم پر اناج فروخت کرنا خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ یہ ان کا مخصوص طریقہ کار ہے؛ اول تو یہ بہت بڑی کمپنیاں ہیں جن کی سالانہ آمدنی کئی غریب ممالک کی مجموعی آمدنیوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ دوئم یہ کہ اگر ایک ملک میں کچھ عرصہ تک خسارہ بھی ہو رہا ہو تو دیگر ممالک میں فائدہ ہوتا رہتا ہے؛ سوئم یہ کہ ان کمپنیوں کو مندرجہ بالا مراحل سے گزرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کیونکہ امریکہ اور یورپ میں ان کمپنیوں کو انتہائی سستے داموں اناج ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں کسانوں کی آمدنی کا بڑا ذریعہ فصل نہیں بلکہ سرکار کی طرف سے ملنے والی نقد امدادی رقوم ہوتی ہیں۔

دیہی آبادی کے لیے کسی معاشی اور سماجی امدادی پروگرام کی عدم موجودگی کا نتیجہ غربت میں تیزی سے اضافہ ہے۔ ۲۰۰۱-۲۰۰۲ کے معاشی جائزے[۴] کے مطابق دیہی آبادی میں غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد ۳۲ فیصد جبکہ نیشنل رورل سپورٹ پروگرام سندھ (این آر ایس پی) کے مطابق ۴۰ فیصد دیہی آبادی غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔[۵] عالمی اداروں کی طرح حکومت پاکستان بھی ''غربت میں کمی'' کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہے۔ حکومت نے نئے مالی سال ۲۰۰۲-۲۰۰۳ میں غربت کے خاتمہ کا ایک حل یہ ڈھونڈا ہے کہ عوام پر غربت کے خاتمہ کے لیے جنرل سیلز ٹیکس نافذ کیا جائے! بجٹ تقریر میں وزیر خزانہ نے کہا کہ ''صوبوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ۵ء۲ فیصد کی شرح سے عوام پر جی ایس ٹی نافذ کریں اور بعد ازاں اس رقم کو غربت کا خاتمہ کرنے والی اسکیموں میں لگایا جائے''۔ دوسری طرف حکومت نے عوامی بوجھ میں اضافہ کرتے ہوئے گھی اور تیل پر جی ایس ٹی نافذ کردیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس سے ۶ افراد پر مشتمل گھرانے کے اخراجات میں ۵ فیصد اضافہ ہوگا۔[۶]

ٹیکس کے ضمن میں وزیرخزانہ نے ملک میں موجود ۲۳۸ بین الاقوامی کمپنیوں کو سب سے زیادہ ٹیکس دینے والوں کی فہرست میں کھڑا کیا ہے۔ وزیرخزانہ یہ بات فراموش کر گئے کہ یہ رقم اس ملک کی غریب عوام سے حاصل کر کے حکومت کے خزانے میں جمع کی گئی ہے جبکہ ان کمپنیوں کا منافع اس کے علاوہ ہے۔ اس میں یقیناً کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی کمپنیاں بھی شامل ہوں گی جو عوام کے تحفظ خوراک، صحت اور ماحول کو بری طرح متاثر کر رہی ہیں۔

وفاقی بجٹ میں عوامی شعبے کی ترقی کے پروگرام (پی ایس ڈی پی) کے لیے ۱۳۴ بلین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ حکومت نے خشک سالی سے متاثر افراد کے لیے کچھ رقم مخصوص کی ہے لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ حکومت نے پچھلے سال بجٹ میں خشک سالی سے متاثرہ افراد کی امداد کے لیے ۷ بلین روپے مختص کیے تھے جو ابھی تک تقسیم نہیں کیے گئے۔[۷]

وزیرخزانہ نے بجٹ تقریر میں ملک کو گندم کی پیداوار میں خود کفیل بنانے پر کسانوں کے کردار کو سراہا ہے لیکن ان کے لیے کسی امداد یا مراعات کا اعلان نہیں کیا۔ اگرچہ حکومت کے معاشی جائزے ۲۰۰۱-۲۰۰۲ کے مطابق قومی پیداوار یا آمدنی میں زراعت کا حصہ ۲۵ فیصد ہے اور ملک کی ۴۴ فیصد آبادی زراعت سے وابستہ ہے۔[۸] حکومت نے زراعت کے لیے صرف تین چھوٹے منصوبوں کا اعلان کیا ہے جو کہ عوامی شعبے کی ترقی کے پروگرام کا حصہ بنا دیے گئے ہیں۔ نئے منصوبوں پر ۲۵۰ ملین ☆ روپے جبکہ باقی ماندہ رقم پہلے سے جاری منصوبوں کی نظر ہو جائے گی۔ نئے منصوبوں میں مویشیوں کی بیماریوں سے نمٹنے کے لیے ۱۰۰ ملین روپے، سمندری مچھلیوں کے ادارے کے تحقیق شروع کرنے کے لیے ۱۰۰ ملین روپے اور کراچی میں میرین ڈپارٹمنٹ ہی کی لیبارٹری کے معیار کو بہتر بنانے پر ۳۰ ملین روپے خرچ کیے جائیں گے۔ ان تمام منصوبوں میں سے صرف ایک منصوبہ ایسا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے زراعت سے تعلق رکھتا ہے باقی کا تعلق ماہی پروری کے شعبے سے ہے۔ حکومت نے اس سال بجٹ میں جو رقم شعبہ زراعت کے لیے مختص کی ہے وہ پچھلے سال کے ۶۶۰ ملین سے تقریباً ۱۳۶ ملین زیادہ بتائی جاتی ہے لیکن زراعت پر حکومت کی عدم توجہ اور اہمیت نہ دینے کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے سال اس شعبے سے ۳۰۰ ملین روپے دوسرے شعبوں کو منتقل کیے گئے۔[۹]

پچھلے مالی سال کے اختتام پر جو اعداد و شمار اور حالات سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف نا قابل یقین ہیں بلکہ باعث شرم بھی ہیں۔ جب ایک طرف ملک کے کسان اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے تو وزارت زراعت نے یہ کہہ کر ۳۰۰ ملین روپے واپس کر دیے کہ اس کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ دوسرے سال کے اختتام پر ۶۶۰ ملین روپے میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی گئی اور جو اعداد و شمار ظاہر کیے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام فنڈز میں سے صرف ۳۵ ملین روپے پہلے سے جاری اسکیموں پر خرچ کر دیے ہیں باقی تمام رقم ویسی کی ویسی ہی پڑی ہے![۱۰] بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وزارت زراعت کے ذمہ داران انتہائی غافل اور نااہل ہیں، جس پر اخبارات نے شدید تنقید بھی کی ہے۔ دوسری طرف اس پر حکومت نے کسی واضح ردعمل کا اظہار بھی نہیں کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سارے عوامل کسانوں کو بے یار و مددگار کرنے کی سازش کا ایک حصہ ہیں، ورنہ یہ ناممکن ہے کہ پوری وزارت ایک بھی پیسہ خرچ کرنے سے قاصر رہے۔ ویسے بھی پچھلے سال بجٹ میں جو رقم زراعت کے لیے مختص کی گئی تھی وہ عوامی شعبے کی ترقی کے مجموعی رقم کا صرف ۶ء فیصد تھی اور یہ بھی خرچ نہ کی جا سکی! اس سال بجٹ میں مختص کیے گئے ۹۶۷ ملین روپے مجموعی بجٹ کا ۱۰ء فیصد بنتا ہے جس سے زرعی شعبے کی حکومت کی نظر میں اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کی ۷۰ فیصد آبادی، ۴۴ فیصد افرادی قوت، قومی پیداوار کے ۲۵ فیصد اور برآمدات میں ۷۰ فیصد شمار کی جانے والی دیہی آبادی اور زراعت کے بارے میں حکومت کے آئندہ مالی سال کے لیے کیا منصوبے ہیں۔ موجودہ فوجی حکومت نے نہ صرف عام شہری، زرعی شعبے اور دیہی آبادی کو بالخصوص نظر انداز کیا ہے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ ان کے مسائل میں مزید اضافہ کرنے والے اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ ماضی میں حکومتیں سال میں ایک مرتبہ عوامی مشکلات میں اضافہ کا اعلان کیا کرتی تھیں لیکن اب یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ حکومت کے عوام دشمن اعلانات کے علاوہ تخمینوں اور پالیسیوں میں رد و بدل کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے اس لیے ایک عام شہری کے لیے سالانہ بجٹ کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ ریاست کے ضرر رساں فیصلوں کی روک تھام، عوامی مزاحمت سے ہی ممکن ہے۔ بہتری کے لیے درکار اقدامات کا حصول اسی صورت میں ہے جب عوام تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈان اور دی نیوز، ۱۶، جون ۲۰۰۲۔
۲۔ دی نیوز، ۲۱، جون ۲۰۰۲۔
۳۔ دی نیوز، ۱۶، دسمبر ۲۰۰۱۔
۴۔ دی نیوز، ۱۴، جولائی ۲۰۰۲۔
۵۔ ڈان، ۱۱، مئی ۲۰۰۲۔
۶۔ نو ریلیف ٹو کامن مین، منصور احمد، دی نیوز، ۱۶، جون ۲۰۰۲۔
۷۔ دی نیوز، ۱۵، جون ۲۰۰۲۔
۸۔ اکنامک سروے، دی نیوز، ۱۴، جون ۲۰۰۲۔
۹۔ دی نیوز، یکم، جون ۲۰۰۲۔
۱۰۔ دی نیوز، یکم، جون ۲۰۰۲۔

☆ ایک بلین = دس لاکھ = ۱،۰۰۰،۰۰۰

ایک بلین = ایک ارب = ۱،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰

کارپوریٹ فارمنگ اور ڈیولپمنٹ باکس
دورخی پالیسیوں کی ایک اور مثال

ولی حیدر

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) کے قیام سے قبل زراعت کی تجارت ممالک کے باہمی تعلقات کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ زراعت دنیا میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کے لیے خوراک کا واحد ذریعہ ہے، اس لیے اس کی تجارت کے لیے کسی باقاعدہ ادارے یا بین الاقوامی قوانین کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی بلکہ اسے ہر ملک کا داخلی مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر ڈبلیو ٹی او کے وجود میں آتے ہی جس طرح انسانی زندگی سے وابستہ انتہائی اہم نوعیت کے شعبوں کو تجارت کے زمرے میں ڈال کر منافع کمانے کے نت نئے ہتھیار، طریقے اور ہتھکنڈے ایجاد کیے گئے، اسی طرح زراعت کو بھی اس دائرے میں شامل کرلیا گیا۔

ڈبلیو ٹی او کے دیگر معاہدوں کی طرح، عالمی زراعتی معاہدہ (اے او اے) بھی سرمایہ دارانہ سوچ رکھنے والے بین الاقوامی کمپنیوں سے وابستہ افراد نے مرتب کیا ہے۔ زراعتی معاہدہ دراصل سرمایہ دارانہ ممالک کے لیے ایک ڈھال اور ترقی پزیر ممالک کے لیے زراعت کے شعبہ میں خود کفالت کی طرف قدم بڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ ایسے ممالک جو پہلے خوراک کے شعبہ میں خود کفیل تھے، اس معاہدے کے عمل درآمد سے اپنی خوراک کے حصول تک کے لیے محتاج ہورہے ہیں۔ یہاں اس دلیل کو مستحکم کرنے کے لیے امریکی سینٹر ہمفرے کی ایک تقریر جو انہوں نے ۱۹۵۷ میں کی تھی سے اقتباس نقل کرنا انتہائی اہم ہے۔ ہمفرے کہتے ہیں:[۱]

”.... لوگ خوراک کے حوالے سے امریکہ کے محتاج ہوسکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے یہ کوئی اچھی خبر نہیں سمجھی جائے گی۔ مگر میرے لیے یہ ایک اچھی خبر ہے کیونکہ کچھ بھی کرنے سے پہلے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کا سہارا لیں اور آپ کے محتاج ہوں تو میرے خیال سے لوگوں کو خوراک کا محتاج کردیا جائے تاکہ جس طرح کا بھی تعاون ان سے درکار ہو باآسانی حاصل کیا جاسکے....“

۱۹۸۰ میں صدر ریگن کے سیکریٹری زراعت جان بلاک نے کہا:[۲]

”.... غذا ایک ہتھیار ہے لیکن اس کا استعمال اس طرح کرنا چاہیے کہ ممالک ہمارے پابند ہوجائیں اس طرح وہ ہم سے اختلاف کرنے سے ہچکچائیں گے....“

امریکی وزیر زراعت این وینامن نے ڈبلیو ٹی او کے دوحہ اجلاس ۲۰۰۱ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:[۳]

”.... ہم مستقل اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ عالمی منڈی میں امریکی کسانوں کی قوت مقابلہ مضبوط تر ہوجائے، یقیناً مستقبل میں امریکی زراعت کو فروغ اسی صورت میں مل سکتا ہے جب امریکہ کی رسائی عالمی منڈیوں تک آسان ہوجائے۔ عالمی زراعتی معاہدے میں شامل نئی نئی برآمدی مواقع کی وجہ سے امریکہ کے لیے گندم، کپاس، گوشت اور دیگر تیار کھانوں کی رسائی دنیا کی مارکیٹ تک آسان ہوجائے گی....“

مندرجہ بالا اقتباسات یہ سمجھنے میں آسانی فراہم کرتے ہیں کہ امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک اپنے زراعت کو مستحکم اور غریب اقوام کو غذا جیسی اہم ترین حق کو بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کتنی دوررس منصوبہ بندی اور اقدامات کا حصہ بنانے سے گریز نہیں کرتے۔

ڈبلیو ٹی او میں زراعتی معاہدہ دراصل خوراک جیسے اہم ضرورت کے لیے غریب ممالک کو محتاج بنانے اور سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک اور ان کی بین الاقوامی کمپنیوں کے سرمایہ کمانے کے لیے ہی مرتب کیا گیا ہے۔ زراعتی معاہدے کی اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ زراعت کے لیے ملکی مراعات میں کمی
۲۔ برآمدی مراعات میں کمی
۳۔ منڈی تک آسان رسائی

زراعت کے لیے برآمدی مراعات سمیت دیگر مراعات میں کمی تیسری دنیا کے کئی ملکوں کی زرعی معیشت پر بری طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ مختلف تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ آزاد تجارت کی وجہ سے زراعت میں استعمال ہونے والی اشیاء بھی مہنگی ہوتی جارہی ہیں۔[۴] تیسری دنیا کے زرعی ممالک کے عام کسان کی حالت زار روز بروز بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ کوریا اور انڈونیشیاء میں چاول جیسی اہم غذائی فصل کی کاشت میں کمی واقع ہوئی ہے کیونکہ سستے چاول کی درآمد اور زرعی پیداوار میں استعمال ہونے والی اشیاء مثلاً کھاد، دوا، ڈیزل وغیرہ کے نرخوں میں اضافے کی وجہ سے مقامی کسان منڈی میں مقابلے کے قابل نہیں رہے۔ اس کے علاوہ برآمدی محصولات میں

کمی کے باعث تیسری دنیا کے کسان باہر سے درآمد کیے ہوئے اجناس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں کسان اپنے روزگار، طرز زندگی اور سستے خوراک سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔

ڈبلیو ٹی او کے زراعتی معاہدے میں تیسری دنیا اور اس کے کسانوں کے لیے شدید نقصانات کا اندازہ کرتے ہوئے تیسری دنیا کے ممالک بشمول پاکستان نے زراعتی معاہدے میں اپنے لیے کچھ ترامیم تجویز کیے جسے ڈیولپمنٹ باکس کا نام دیا گیا ہے۔ زراعتی معاہدے میں ڈیولپمنٹ باکس کی شمولیت کی تجویز ۲۰۰۰ میں پیش کی گئی تھی، جس کا بنیادی مقصد:[۵]

۱۔ مقامی زرعی پیداوار میں اضافہ اور اس کے تحفظ کی صلاحیت بڑھانا۔

۲۔ تحفظ خوراک کی صلاحیت میں اضافہ اور اس خوراک کے حصول تک خصوصاً غریب ترین آبادی کی رسائی۔

۳۔ دیہی آبادی سے وابستہ کسانوں اور مزدوروں کی ملازمت یا کام کے مواقع کی بہتری اور ملازمت کا تحفظ۔

۴۔ سستی درآمدات کے شدید حملوں سے چھوٹے اور نظر انداز کیے گئے کسانوں کا تحفظ۔

۵۔ پیداوار اور پیداوار بڑھانے کی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے امداد فراہم کرنے کی گنجائش۔

۶۔ عالمی مارکیٹ تک آسان رسائی اور قیمت کے لحاظ سے دیگر ممالک کے ساتھ مقابلے کا ماحول۔

۷۔ ایسے ممالک جو اپنی خوراک کا انحصار صرف اور صرف درآمدی فصلوں پر کرتے ہیں ان کے چیدہ چیدہ مسائل پر نظر ثانی۔

ڈیولپمنٹ باکس کی تجویز پر روز اول سے ہی ڈبلیو ٹی او کے اندر اور باہر، دونوں جانب سے حمایت اور تنقید میں دلائل دیے جا رہے ہیں۔ ڈبلیو ٹی او سے تعلق رکھنے والے سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک اور تیسری دنیا کے چند ممالک کا کہنا ہے کہ ڈبلیو ٹی او کے اندر دو مختلف طرح کے قوانین اس بنیادی مقصد کو زائل کر دے گا جس کی خاطر یہ ادارہ وجود میں لایا گیا ہے یعنی آزاد معیشت کے اصولوں کو عالمی منڈی پر رائج کرنا اور ان کو قانونی حیثیت دینا ہے۔ اس لیے ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پزیر ممالک دونوں کے لیے قوانین میں یکسانیت ضروری ہے تاکہ آزاد معیشت میں مقابلے کا رجحان اور ماحول پیدا کیا جا سکے۔ دہرے قوانین کی موجودگی سے تجارت کو شدید نقصان پہنچے گا۔ اس کے برعکس ڈیولپمنٹ باکس کی حمایت کرنے والے ممالک کا کہنا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے لیے کچھ رعایت اور آسانیاں دی جانی چاہیے جس سے تیسری دنیا کے بہت سے ممالک کی زرعی معیشت کو مستحکم کرنے میں مدد ملے گی۔ ان کے خیالات اس حوالے سے متضاد ہیں کہ کون سے ممالک اس زمرے میں آ سکتے ہیں اور کن ممالک کو کس قسم کی مراعات یا آسانیاں فراہم کی جا سکتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ ممالک کے بہت سارے اصلاح پسند گروہ اور ادارے مثلاً برطانوی ڈونر ایجنسیاں کیتھولیک ایجنسی فار اوورسیز ڈیولپمنٹ، آکسفیم، ایکشن ایڈ اور امریکی این جی او ایگریکلچر اینڈ ٹریڈ پالیسی وغیرہ بھی ڈیولپمنٹ باکس کی زراعتی معاہدے میں شمولیت کو غریب ممالک کے لیے ایک بہتر اقدام کے طور پر دیکھتے ہیں اور پرزور طریقے سے اس خیال کو فروغ دے رہے ہیں کہ غریب ممالک کے لیے الگ رویہ کے اختیار کرنے سے ان ملکوں کی معیشت کسان اور عوام اور خاص کر خواتین کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیولپمنٹ باکس تین بنیادی اصولوں پر انحصار کرتا ہے۔

۱۔ یہ صرف اور صرف ترقی پذیر ممالک کے لیے ہے۔

۲۔ یہ ترقی پزیر ممالک کے چھوٹے کسانوں کے مفاد میں ہے۔

۳۔ یہ حکومتوں کو سہولت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے لیے خوراک کی غرض سے کاشت کیے جانے والی بنیادی فصلوں کو تحفظ فراہم کرے۔

اصلاح پسندوں کے برعکس انقلابی گروہ کا موقف ہے کہ ڈیولپمنٹ باکس کے ذریعہ ملنے والی چھوٹ اور مراعات سے بھی غریب ممالک اور ان کے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ڈبلیو ٹی او یا اس کے کسی معاہدے میں ترامیم میں کمی بیشی سے کوئی مثبت اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ڈبلیو ٹی او کا قیام ہی سرمایہ دارانہ نظام اور تمام امتیازات کی بنیاد ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر ایسے اصول سموئے ہوئے ہے کہ جس کے تحت سرمایہ دار کمپنیاں ہر فائدے کو اپنے لیے مخصوص کر لیتی ہیں۔ وہ سرمائے کے زور سے وسائل پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً دیکھا گیا ہے کہ مال گاڑیاں نجکاری کی وجہ سے نجی کمپنیوں کو بیچ دی جاتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں اکثر زرعی کمپنیاں ان کو خرید لیتی ہیں۔ چھوٹے کسان کو اپنی پیداوار منڈی تک لے جانے کے لیے ان کمپنیوں کی مال گاڑی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگر کمپنیوں کے مفاد میں ہو کہ وہ چھوٹے کسان کی زمین کو ہتھیا لیں تو وہ ان کے سامان کے لیے مال گاڑی میں جگہ ہی نہیں دیتے ہیں۔ ان حالات میں یقینی ہے کہ کسان اپنی زمین کو یا تو بیچ دیں گے اور کمپنیوں کے راستے سے ہٹ جائیں گے یا بالآخر ان کا دیوالیہ ہو جائے گا۔ کم وسائل اور اثر و رسوخ رکھنے والی عوام کو ان حالات سے لڑنے کے لیے مقامی و عالمی سطح پر انتہائی نظم و ضبط اور اتحاد کی ضرورت ہے، جس کے بعد ہی ان سرمایہ دار کمپنیوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں حالیہ کارپوریٹ فارمنگ ایکٹ کا اجراء بھی دراصل ڈبلیو ٹی او کے آزاد تجارت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے تاکہ بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے پاکستان کی زمینوں تک رسائی ممکن بنائی جا سکے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق تمام صوبوں کی سرکاری زمینوں کے اعداد و شمار معلوم کر لیے گئے ہیں۔ یہ زمینیں پہلے مرحلے پر ملکی اور غیر ملکی کمپنیوں کو پٹے پر دی جائیں گی، جس میں سندھ کی ساڑھے سات لاکھ ایکڑ زمین بھی شامل ہے جو اس وقت سندھ کے مختلف محکموں کے زیر کنٹرول ہیں۔[۶]

کارپوریٹ فارمنگ کے تحت سرکاری زمینوں کو پہلے ۵۰ سال اور پھر اسے مزید ۴۹ سال تک کے لیے پٹہ پر دیا جا سکے گا، جبکہ اس پر انکم ٹیکس کی چھوٹ، زیر کاشت

زمین کے لیے پانچ سال، بارانی زمینوں کے لیے ۷ سال اور غیر کاشت شدہ زمینوں کے لیے ۱۰ سال تک کی ہے۔ نئے قوانین کے تحت ملکی یا غیر ملکی زمینداروں اور بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کو کم سے کم ۱۲۰۰ ایکڑ اور زیادہ سے زیادہ زرعی زمین کے حصول پر کوئی پابندی نہیں۔ کارپوریٹ طریقہ زراعت (کارپوریٹ فارمنگ) اپنانے کا بنیادی مقصد فصل کی کاشت اور اس کے بعد کے (مثلاً مختلف اقسام کے تیار کھانوں کو تیار کرنے والے کارخانوں) عمل کو ایک جگہ پر یکجا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ زراعت میں استعمال ہونے والی مشینری اور آلات پر درآمدی ڈیوٹی کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ حکومت کے بقول ان تمام اقدامات سے ایک طرف تو زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور دوسری طرف غیر کاشت شدہ زمین کو بھی زیر کاشت لایا جاسکے گا۔ حکومت کا موقف ہے کہ زراعت کو جدید خطوط پر استوار کرنا دراصل کسانوں کی حالت کو بہتر بنانا اور ملکی برآمدات میں اضافہ کرنا ہے۔ کارپوریٹ فارمنگ دراصل بڑے زمینداروں اور بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کو فائدہ بہم پہنچانے کے لیے ہے کیونکہ صرف ان کے پاس ہی اتنی قوت خرید موجود ہے کہ ان سارے وسائل تک رسائی حاصل کرسکیں گے۔ جدید زراعت اور اس میں کی جانے والی تحقیقات سے وابستہ ادارے اور کمپنیاں بظاہر دنیا سے بھوک کا خاتمہ کرنے کی تگ و دو میں مصروف نظر آتی ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان بین الاقوامی کمپنیوں کا بنیادی مقصد صرف منافع کا حصول ہے۔ زراعت میں جدید اصلاحات پر زور دینے سے ان کا مقصد دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے خوراک میں خود کفالت حاصل کرنا نہیں بلکہ منافع کمانے کے لیے نت نئے ذرائع تلاش اور اس کے عوض دنیا بھر کے عوام کو خوراک کی حق خودارادیت سے محروم کرنا ہے۔

ایک طرف پاکستان اور دوسرے ترقی پزیر ممالک نے زراعتی معاہدے میں ڈیولپمنٹ باکس کے ذریعے اپنے کسانوں اور زراعت کے شعبوں کو تحفظ فراہم کرنے کی تجویز پیش کی ہے جبکہ دوسری طرف کارپوریٹ فارمنگ جیسی پالیسیوں کو لاگو کررہی ہیں کہ جس کے ذریعہ بالآخر چھوٹے کسانوں کو اپنی زمینوں کے ساتھ ساتھ اپنے خوراک کی حق خودارادیت سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔

زراعتی معاہدے میں ڈیولپمنٹ باکس پر معترض امریکہ نے حال ہی میں اپنے کسانوں کو دی جانے والی امدادی رقوم کے سلسلے میں ایک نیا قانون پاس کیا جو فارم بل کہلاتا ہے، جس میں امریکہ نے اپنے کسانوں کو اب تک دی جانے والی امدادی رقوم کے سلسلے میں سب سے بڑی امداد کا اعلان کیا۔ فارم بل کی مالیت ۱۸۰ بلین ڈالرز یعنی ۱۰۸۰ ارب روپے بنتی ہے۔ یہ رقم آئندہ چھ سال کے دوران کسانوں کو فراہم کی جائے گی۔

ناقدین کا خیال ہے کہ امریکی فارم بل ڈبلیو ٹی او کے اصولوں اور آزاد تجارت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ اس میں ڈبلیو ٹی او کے تمام قوائد کو سرے سے نظر انداز کردیا گیا ہے کیونکہ اس سے آزاد تجارت اور منڈی تک رسائی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس فارم بل پر ترقی پزیر ممالک ہی نہیں یورپی یونین، کینیڈا اور اسٹریلیا بھی تنقید کرنے والوں میں شامل ہیں۔ ان ممالک کا موقف ہے کہ امریکہ اپنے کمپنیوں کو سہولتیں مہیا کرکے آزاد تجارت کو شدید نقصان پہنچا رہا ہے اور اس کے سب سے زیادہ منفی اثرات تیسری دنیا کے ممالک پر پڑیں گے۔ حال ہی میں امریکہ نے ڈبلیو ٹی او میں ایک نئی تجویز پیش کی ہے جس کے مطابق دنیا کے دیگر ممالک زرعی درآمدی و برآمدی ڈیوٹی اور مراعات میں کمی کریں۔ امریکہ کی اس تجویز کے تحت ڈبلیو ٹی او کے ممبر ممالک اگلے پانچ سال کے دوران برآمدی ٹیکس میں کم سے کم ۲۵ فیصد تک کی کمی اور دنیا کے لحاظ سے اوسطاً ۶۲ فیصد تک محصولات میں کٹوتی شامل ہے۔

ایک طرف امریکہ فارم بل کے نام سے اپنے کسانوں کے لیے کئی حوالوں سے امدادی رقوم اور دیگر مراعات کے اعلانات کررہا ہے اور دیگر ترقی یافتہ ممالک بھی اپنے کسانوں اور زراعت کو تحفظ فراہم کرنے کے نت نئے طریقوں پر عمل پیرا ہیں اور دوسری طرف پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ایک زرعی ملک میں ۹۳ فیصد چھوٹے کسانوں کو ان کی زمین اور روزی سے بے دخل کرنے والے مسودے کارپوریٹ فارمنگ بل کا صدارتی حکم نافذ ہورہا ہے۔

ترقی پزیر ممالک سمجھتے ہیں کہ ڈیولپمنٹ باکس کے زراعتی معاہدے میں شمولیت سے چھوٹے کسانوں اور عوام کے تحفظ خوراک کو کسی حد تک ممکن بنایا جاسکتا ہے لیکن امریکہ میں حال ہی میں پاس ہونے والے فارم بل اور پاکستان میں کارپوریٹ فارمنگ جیسے اقدامات کے بعد یہ بات اخذ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ ان تمام پالیسیوں پر عمل درآمد کا مقصد دراصل لوگوں کی خوراک تک آسان رسائی نہیں بلکہ ان کے منہ سے نوالہ چھیننا اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہے۔

حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قلیل المعیاد حل کے بجائے ٹھوس اور جامع حل کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ دنیا بھر کے چھوٹے کسانوں اور عوام کے تحفظ خوراک اور ان کے خوراک کے حق خودارادیت کو منوانے کے لیے جدوجہد کا ایک لائحہ عمل ترتیب دیا جائے کیونکہ اگر دنیا بھر سے بھوک و افلاس، تنگدستی، بے بسی اور محرومیوں کا خاتمہ کرنا ہے تو زراعت سے ڈبلیو ٹی او کی علیحدگی کی جدوجہد اور بالآخر عدم مساوات پر مبنی ادارہ ڈبلیو ٹی او کا خاتمہ انتہائی ضروری ہے تب ہی جاکر عوام اور ممالک کو اپنی خوراک پر حق خودارادیت رکھنے کے لیے مناسب فیصلہ کرنے کے مواقع حاصل ہوسکیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ ایل ایس اسٹیور یوناس، گلوبل رفٹ، ولیم مورو اینڈ کمپنی انٹرنیشنل، نیویارک، ۱۹۸۱ صفحہ ۴۴۳۔

۲۔ ایل ایس اسٹیور یوناس، گلوبل رفٹ، ولیم مورو اینڈ کمپنی انٹرنیشنل، نیویارک، ۱۹۸۱ صفحہ ۴۴۳۔

۳۔ http://www.usconsulate.org.hk/uscn/trade

۴۔ پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک بخالی وعدہ خالی پیپٹ، پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک، ۲۰۰۱۔

۵۔ نان پیپر آن "دی ڈیولپمنٹ باکس" http://www.wtowatch.org/library/admin

۶۔ جنگ، ۱۲، اگست ۲۰۰۲۔

دوسری عالمی خوراک کانفرنس: تحفظ خوراک پر آزاد تجارت کی برتری

عذرا طلعت سعید

دوسری عالمی خوراک کانفرنس (ورلڈ فوڈ سمٹ) روم اٹلی میں جون ۱۰-۱۳، ۲۰۰۲ کو منعقد ہوئی۔ پہلی کانفرنس بھی ۶ سال قبل ۱۹۹۶ میں روم اٹلی میں ہی منعقد ہوئی تھی۔ دوسرے عالمی خوراک کانفرنس کے انعقاد کا مقصد پچھلے کانفرنس میں کیے گئے فیصلوں کا تجزیہ کرنا تھا۔

۱۹۹۶ میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ۱۸۰ ممالک نے سال ۲۰۱۵ تک دنیا میں غذائی کمی کے شکار ۸۰۰ ملین ☆ افراد کی تعداد کم کر کے نصف کرنے کا عہد کیا تھا۔ عالمی ادارہ خوراک وزراعت کے مطابق ۱۹۹۷-۱۹۹۹ میں جو افراد ضرورت کے تحت غذا حاصل کرنے میں ناکام تھے ان میں سے ۷۷ ملین افراد ترقی پذیر ممالک میں، ۲۷ ملین ترقی کی طرف تیزی سے گامزن ممالک میں اور ۱۱ ملین ترقی یافتہ ممالک میں پائے جاتے تھے۔[۱] ۱۹۹۶ سے ۲۰۱۵ تک ہر سال ۲۲ ملین افراد کو اگر خوراک کی کمی کے دائرے سے نکالا جائے تو ہدف تک پہنچنا ممکن ہے لیکن ۶ سال بعد دوسری کانفرنس کے موقع پر اس ہدف کا حصول مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا ہے کیونکہ ۲۰۰۲ عالمی خوراک کانفرنس تک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سالانہ ۲۲ ملین کے بجائے کل ۶ ملین افراد کو بھوک کے دائرے سے نکالا جا سکا ہے۔[۲]

عالمی ادارہ خوراک وزراعت (فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن) کے مطابق بھوک کے دائرے سے نکالے گئے ۶ ملین افراد کی کمی کا حصول اس لیے ممکن ہو سکا کیونکہ چین میں ۱۹۹۰ کی دہائی میں تقریباً ۷۶ ملین افراد غذائی کمی کا دائرہ توڑنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر چین میں یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی تو دنیا میں ۴۰ ملین ایسے افراد کا اضافہ ہوتا جو غذائی کمی اور عدم تحفظ خوراک کا شکار ہوتے۔[۳]

خوراک کے حوالے سے اس قدر بگڑی ہوئی صورت حال کے باوجود عالمی خوراک کانفرنس ۲۰۰۲ میں ترقی یافتہ ممالک کی توجہ خوراک میں کمی یا بھوک کے شکار آبادی پر نہ تھی بلکہ ان کی بھرپور کوشش رہی کہ حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات اور انہیں پورا کرنے والے وعدے نہ کیے جائیں مثلاً ''حق غذا'' کے استعمال پر کئی ترقی یافتہ ممالک کو اعتراض تھا۔ اعتراض کرنے والوں میں امریکہ اور کینیڈا جیسے ترقی یافتہ ممالک سرفہرست ہیں۔ امریکہ کو خدشہ تھا کہ اگر حق غذا کو تسلیم کیا جائے تو ریاستوں کو قانونی طور پر یہ حق عوام کو دینا پڑے گا۔ اس حق کی فراہمی میں ناکامی کی صورت میں حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کیے جانے کے امکانات ہیں۔ کینیڈا کی کوشش تھی کہ وہ اس اصطلاح کو ہی عالمی کانفرنس کے مسودے سے نکال باہر کر دے۔ امریکہ کو ''حق غذا'' پر عالمی سطح پر رائے عامہ ہموار ہونے اور اس پر کسی بھی قابل عمل مسودے پر سخت تشویش لاحق ہے۔ کینیڈا کا خیال ہے کہ خوراک کا حق عالمی اعلامیہ برائے انسانی حقوق میں پہلے ہی تسلیم کیا گیا ہے لہذا اس پر دوبارہ توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بالآخر بحث ومباحثہ کے بعد عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے میں خوراک کے حق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''ہر فرد کو حق ہے کہ وہ صاف اور غذائیت سے بھرپور غذا حاصل کرے''۔[۴]

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے لیے کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھنے والے ۸۰ سربراہان مملکت کانفرنس میں شریک ہوئے جبکہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور دنیا میں خوراک کی سیاست پر اثر انداز ہونے والے ممالک میں سے کسی قابل ذکر ملک کے سربراہ مملکت کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ اٹلی کے فاشسٹ نظریات رکھنے والے صدر کو میزبان ملک ہونے کی وجہ سے شرکت کرنی پڑی جبکہ اسپین کے صدر نے یورپی یونین کی صدارت پر فائز ہونے کی وجہ سے شرکت کی۔ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی حق غذا کی مخالفت اور سرد رویے ان کے دہرے معیار اور مقاصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہ ممالک انسانی حقوق کے عالمی دعویدار اور رکھوالے ہیں لیکن دوسری طرف دنیا سے بھوک وافلاس کے خاتمے کی طرف اٹھنے والے ہر عملی اقدام کی راہ میں سب بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔ خوراک کو بنیادی انسانی حق تسلیم نہ کرنے کی سب بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کی بڑی بڑی کمپنیاں خوراک جیسی ''شئے'' سے منافع کمانے میں مصروف ہیں اس لیے یہ خوراک کو منافع کمانے والی شکل میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کی اقدامات کو پوری طرح عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ کانفرنس کے مسودے میں تجارت کو خوراک کی خاطر کیے جانے والے دیگر اقدامات پر اولیت دی گئی، مثلاً اس کانفرنس کے مسودے میں پہلی خوراک کانفرنس میں تحریر کیے جانے والے حکمت عملی مسودے میں تجارت کے حوالے سے کیے ہوئے اقدامات کی تکمیل کے وعدوں کی یقین دہانی کرائی گئی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ''تجارت ایک ایسی کنجی ہے جس کے تحت عالمی تحفظ خوراک کو یقینی بنایا جا سکتا ہے''۔[۵] اس کے علاوہ ڈبلیو ٹی او کے عالمی زراعتی معاہدے میں کیے جانے والے وعدوں کو متعین وقت میں پورا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے میں مونٹرے کانفرنس، ڈبلیو ٹی او کے آخری وزارتی کانفرنس (جو دوہا میں ۲۰۰۱ میں منعقد ہوئی) اور افریقہ کے لیے نئے ترقیاتی معاہدے نیپاڈ کا خاص ذکر ہے۔ ان سب معاہدوں اور کانفرنسوں کا مرکزی خیال آزاد تجارت ہی کو فروغ دینا تھا۔ خاص طور پر مونٹرے کانفرنس جو کہ ۲۰۰۲ کے شروع میں میکسیکو میں منعقد ہوئی کی مکمل توجہ بین الاقوامی

تجارت پر مرکوز تھی، حالانکہ اس کانفرنس کا مقصد ترقی پزیر ممالک کی ترقی کے لیے نئی راہیں تلاش کرنا تھیں۔ عالمی خوراک کانفرنس کے مسودے میں ان تمام کانفرنسوں کا ذکر اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہے کہ سارے بین الاقوامی ادارے چاہے وہ اقوام متحدہ ہو یا ورلڈ بینک، آزاد تجارت کے اصولوں کے مکمل عمل درآمد کو ہر مسئلے کے واحد حل کے طور پر پیش کرنے کے لیے تلے ہوئے ہیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک مختلف بین الاقوامی مسودوں اور معاہدوں کی آڑ لے کر اپنی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں اور بڑے بڑے سرمایہ دار کسانوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ ترقی یافتہ ممالک دوسرے ممالک کی زراعت اور کسان کو مختلف اداروں (جس میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی نجکاری اور مراعات میں کمی کرنے والی پالیسیوں اور ڈبلیو ٹی او کے عالمی زراعتی معاہدے شامل ہیں) کے ذریعے زراعت اور زراعت سے وابستہ دیہی آبادیوں کو مہنگی پیداوار اگانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بین الاقوامی کمپنیاں ترقی پذیر ممالک میں سستی قیمتوں پر اناج فروخت کر رہی ہیں۔ یہ امر اس لیے ممکن ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی حکومتیں ہزاروں، لاکھوں ڈالرز کی شکل میں کسانوں کو مراعات فراہم کرتی ہیں مثلاً امریکہ نے حال ہی میں ایک نئے قانون (فارم بل) کے تحت اپنے کسانوں (جن میں سے ۹۰ فیصد کسان بڑے سرمایہ دار ہیں) کو ۱۵-۲۰ ارب ڈالرز فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ امریکی صدر بش کا کہنا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ امریکی زرعی پیداوار کے لیے غیر ملکی منڈیوں تک رسائی کو مزید آسان بنایا جائے۔ ان کے بقول ''ہم چاہتے ہیں کہ اپنی گائے کا گوشت، اپنی مکئی اور دالیں دنیا کے لوگوں کو بیچیں کیونکہ خوراک حاصل کرنا ان کی ضرورت ہے''۔[۶]

صدر بش کے یہ خیالات آزاد تجارت کے نظریہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ آزاد تجارت کے تحت یہ کوششیں کی جارہی ہیں کہ انسانی حق کو صرف ''شئے'' کی حیثیت دے کر، اس کی خرید و فروخت کی راہ ہموار کی جائے۔ اس کے بعد جو بھی اس شئے کو خریدنے کے قابل ہو وہ اسے ''حاصل'' کر لے۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی کوشش ہے کہ لفظ ''تحفظ خوراک'' کے معنیٰ کو محدود کر دیا جائے۔ یعنی تحفظ خوراک کو اس طرح بیان کیا جارہا ہے کہ ''ہر ایک کو حق ہے کہ وہ صاف اور غذائیت سے بھرپور خوراک حاصل کر سکے''۔ لفظ ''حاصل'' استعمال کر کے خوراک تک رسائی کا بوجھ عام انسان پر ڈال دیا گیا ہے اور قانونی طور پر خوراک ''مہیا'' کرنے کی ذمہ داری ریاست پر سے ہٹادی گئی ہے۔ اس سازش کے تحت ترقی یافتہ ممالک کی زرعی بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ زرعی پیداوار کو ہر جگہ فروخت کر سکیں۔ عوام یقیناً زر کی مدد سے اسے ''حاصل'' کر سکتی ہے۔ یعنی تحفظ خوراک اب صرف عوام کی قوت خرید تک ''محفوظ'' ہے۔

آج کل تحفظ خوراک پر بحث کی اصل وجہ ترقی یافتہ ممالک اور ان کی بین الاقوامی کمپنیوں کے زراعت کے شعبے کو آزاد تجارت کے شکنجے میں جکڑنا اور قوموں کی زرعی تہذیب کو روندنا ہے۔ اس بنیاد پر اب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی ہے اس میں تحفظ خوراک کی جگہ حق خودارادیت برائے خوراک کے نعرے نے لے لی ہے۔ حق خودارادیت برائے خوراک عوام، آبادیوں اور ممالک کا وہ حق ہے جس کے تحت وہ اپنی ماہی گیری، زرعی معاش وزمین، پیداوار اور خوراک کے لیے ایسی پالیسیاں مرتب کر سکیں جو ان کی تہذیب وروایات، معاشرہ ومعیشت اور ماحولیات کے لیے سود مند ثابت ہوں۔

پہلی خوراک کانفرنس کے برعکس دوسرے کانفرنس میں بائیوٹیکنالوجی کے زراعت میں استعمال پر اتفاق کیا گیا ہے۔ مسودے کے مطابق ''عالمی ادارہ خوراک و زراعت اور مختلف بین الاقوامی تحقیقی اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ زرعی تحقیق کو فروغ دیں جس میں بائیوٹیکنالوجی بھی شامل ہے''۔[۷] عالمی ادارہ خوراک و زراعت کا بائیوٹیکنالوجی کے زرعی استعمال کی حمایت محفوظ غذا اور عام کسان کے ذریعہ معاش دونوں پر ایک سنگین وار ہے۔ اس وقت دنیا میں بائیوٹیکنالوجی کے ذریعے جو نیا اناج کاشت کیا جارہا ہے یہ جینیاتی تبدیلی کے ذریعے وجود میں لایا گیا ہے۔ جینیاتی تبدیلی سے پیدا ہونے والی فصلیں اور مچھلیاں جی ایم اوز کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں جی ایم اوز کے خلاف سائنسدان، کسان گروہ، اساتذہ اور شہری آواز بلند کر رہے ہیں۔ جی ایم اوز کے خلاف شدید مزاحمت کو دیکھتے ہوئے یورپ میں جی ایم اوز کی پیداوار اور درآمد پر کئی سخت ضابطے لگائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے باشندوں کی قوت خرید بہت زیادہ ہے اور وہ منڈی میں فروخت ہونے والی اشیاء کی مخالفت کر کے بین الاقوامی کمپنیوں اور اپنی ریاستوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس تیسری دنیا کے ممالک اپنی ضروریات کے لیے ترقی یافتہ ممالک کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک اور آئی ایم ایف، ورلڈ بینک یا پھر ایشیائی ترقیاتی بینک جیسے اداروں کے اس قدر مقروض ہوتے ہیں کہ ہر شرط ماننے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی پذیر ممالک کے مصنوعات کی منڈی بھی ترقی یافتہ ممالک ہی ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک یا دوسرے طریقے سے ترقی پذیر ممالک پر امریکہ جیسی صنعتی اور فوجی طاقت اپنے فیصلے آسانی سے مسلط کروانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

دوسری عالمی خوراک کانفرنس میں امریکہ میں اس بات پر شدید اصرار کیا کہ جینیاتی پیداوار سے حاصل کی ہوئی خوراک کو بھوک کے خاتمے کے لیے مرکزی کردار کی حیثیت دینی چاہیے۔ یقیناً امریکہ نے یہ مطالبہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے کیا تھا۔ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک نے جینیاتی خوراک کے درآمد پر شدید مزاحمت کی ہے۔ اس لیے امریکہ نے جی ایم اوز کی برآمد کے لیے تیسری دنیا کا رخ کیا ہے۔ اس سلسلے میں امداد کے طور پر دی جانے والی خوراک ایک کامیاب حربہ ہے۔ امدادی خوراک پروگرام (فوڈ ایڈ پروگرام) کا خوراک کی خود کفالت اور مقامی کسانوں کی روزگار پر منفی اثر مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ روایتی طرز خوراک وزندگی اور خود انحصاری کی طرف بڑھنے والے اقدامات بری طرح متاثر ہوتے ہیں کیونکہ جن ممالک کو امریکہ خوراک کے طور پر امداد دیتا ہے وہ اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ کسی اور ملک سے یہ اناج درآمد نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ مال برداری کے لیے امریکی جہاز ہی استعمال کیے جانے کی

شرط ہوتی ہے۔[8]

ایک اطلاع کے مطابق امریکہ ہر سال تیسری دنیا کو ۲ ملین ٹن جی ایم اوز برآمد کرتا ہے۔ امریکی بین الاقوامی امداد پروگرام (یو ایس اے آئی ڈی) نے ایک بین الاقوامی زرعی کمپنی مونسانٹو کو تقریباً ۳ لاکھ ڈالرز فراہم کیے ہیں تا کہ وہ جینیاتی شکر قندی پر تحقیق کر سکے۔ اس سلسلے میں مونسانٹو کو مزید مدد ورلڈ بینک فراہم کرے گا۔[9]

مونسانٹو، جینیاتی طور پر تیار کردہ چاول ''سنہرے چاول'' (گولڈن رائس) بچوں میں وٹامن اے کی کمی دور کرنے کے لیے ایک محفوظ غذائی حل کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ تیسری دنیا کے غذائی حل اور بھوک پر قابو پانے کے لیے جینیاتی پیداوار کا مسلسل ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر دوسری عالمی خوراک کانفرنس میں زراعت کے شعبے میں بائیوٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت بھی دے دی گئی ہے، لیکن یہ رائے عام ہے کہ جی ایم اوز نہ صرف انسانی صحت بلکہ ماحولیات اور زراعت کے لیے بھی نقصاندہ ہو سکتے ہیں۔ جی ایم اوز پر ایک اعتراض قیمت کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے مثلاً مونسانٹو کا تیار کردہ سنہرا چاول اتنا مہنگا ہے کہ عام انسان کے قوت خرید سے باہر ہے۔

تحفظ خوراک کا حل صرف حق خودارادیت میں پوشیدہ ہے۔ جب تک کسی علاقہ کے باشندوں کو یہ فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہوگی کہ وہ زرعی پیداوار اپنی خوراک کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کریں، تحفظ خوراک کا حصول ایک خواب ہی رہے گا۔ روایتی طریقہ زراعت تحفظ خوراک اور ماحول دونوں کے لیے سازگار مانا جاتا ہے۔ یہ یقیناً آزاد تجارت پر یقین رکھنے والوں کی سازش تھی کہ عالمی کانفرنس میں بائیوٹیکنالوجی کی تو اہمیت تسلیم کر لی گئی لیکن روایتی طریقہ زراعت کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

ان وجوہات کی بناء پر کانفرنس میں شریک عوامی گروہوں نے کانفرنس کے مسودے کو یکسر مسترد کیا اور کہا کہ یہ مسودہ اصل میں بھوک بڑھانے، آزاد تجارتی پالیسیوں کو فروغ دینے اور اس کو عالمی سطح پر رائج کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔ ان اقدامات کے نفاذ کو ممکن بنانے کے لیے فوجی قوت بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ عوامی گروہوں کا خیال تھا کہ ان پالیسیوں کے برعکس عوامی مفاد کو مدنظر رکھ کر بھی پالیسیاں رائج کی جا سکتی ہیں، جس سے عوام کے وقار، ذریعہ معاش اور بہتر طرز زندگی کی حفاظت کی جا سکے۔ ان گروہوں کے نزدیک صرف حق خودارادیت برائے خوراک ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے تحت اقوام اور انسانی گروہوں کو ایک پروقار زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ اس طرز زندگی کے حصول کے لیے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او اور ترقی یافتہ ممالک کی آزاد تجارتی پالیسیوں کی سخت مخالفت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عوامی گروہوں نے اس بات پر زور دیا کہ زراعت کے شعبے کو ڈبلیو ٹی او سے مکمل طور پر باہر کر دیا جائے۔ جینیاتی انجیئرنگ کا خاتمہ کیا جائے اور جی ایم اوز سے تیار کردہ اناج کو امدادی خوراک کے طور پر دینے کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ عراق اور کیوبا پر خوراک کی بندش، فلسطین پر غیر قانونی قبضہ اور عوامی تحریکوں پر پابندیوں کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی۔

عالمی خوراک کانفرنس اور این جی اوز کی متوازی کانفرنس (فورم حق خودارادیت برائے خوراک) میں شرکت کی غرض سے دنیا بھر کی تنظیمیں روم، اٹلی آئی تھیں۔ ان میں سے ایک تنظیم پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک برائے ایشیاء و بحرالکاہل (پین اے پی) نے ایشیائی ممالک کی کئی تنظیموں کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا تھا۔ ان میں بنگلہ دیش، پاکستان، ہندوستان، ملیشیاء اور فلپائن کے علاوہ کئی ممالک کی تنظیمیں شامل تھیں۔ ان تنظیموں کی طرف سے پین اے پی نے ایک مشترکہ بیان کانفرنس کے میزبان ادارہ برائے خوراک وزراعت کو پیش کیا جس میں کئی مختلف مطالبات درج تھے۔ سرفہرست مطالبہ یہ تھا کہ ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالا جائے۔ اس کے علاوہ حق خودارادیت برائے خوراک کو ایک یقینی عمل بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ پین اے پی کے پلیٹ فارم سے شرکت کرنے والی فلپائن اور نیپال کی ہاری تنظیموں کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاری دن رات محنت کرنے کے باوجود اپنے لیے بہتر روزی کا بندوبست کرنے سے قاصر ہیں اور قحط کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

مکمل حقائق کا سامنا کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ عوامی گروہوں کے نعرے ''ڈبلیو ٹی او کو زراعت سے باہر نکالو'' کے بغیر بھوک کا خاتمہ ناممکن ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ایف اے او، آئی ایف اے ڈی، ورلڈ فوڈ پروگرام، ریوڈیوسنگ پاورٹی اینڈ ہنگر: دی کریٹیکل رول آف فائینسنگ فور فوڈ، ایگریکلچر اینڈ رورل ڈیولپمنٹ، ۲۰۰۲، صفحہ ۸۔

۲۔ ٹیرا ویوا نمبر ۱، ورلڈ فوڈ سمٹ، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲، انٹر پریس سروس، صفحہ ۳۔

۳۔ ٹیرا ویوا نمبر ۱، ورلڈ فوڈ سمٹ، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲، انٹر پریس سروس، صفحہ ۳۔

۴۔ انٹرنیشنل الائنس اگینسٹ ہنگر، مسودہ ورلڈ فوڈ سمٹ، روم، اٹلی، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲۔

۵۔ کمٹمنٹ ۴، ورلڈ فوڈ سمٹ پلان آف ایکشن، ورلڈ فوڈ سمٹ، روم، اٹلی، ۱۳-۱۷، نومبر ۱۹۹۶۔

۶۔ ٹیرا ویوا نمبر ۳، ورلڈ فوڈ سمٹ، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲، انٹر پریس سروس، صفحہ ۶۔

۷۔ انٹرنیشنل الائنس اگینسٹ ہنگر، مسودہ ورلڈ فوڈ سمٹ، روم، اٹلی، ۱۰-۱۳، جون ۲۰۰۲۔

۸۔ الزبت براؤ، ورلڈ فوڈ سمٹ: فوڈ ایڈ اینڈ جینی ٹیکلی موڈی فائڈ آرگینیزم، کیتو، جون ۲۰۰۲۔

۹۔ الزبیت براؤ، ورلڈ فوڈ سمٹ: فوڈ ایڈ اینڈ جینی ٹیکلی موڈی فائڈ آرگینیزم، کیتو، جون ۲۰۰۲، صفحہ ۲۱۔

☆ ایک ملین = دس لاکھ = ۱،۰۰۰،۰۰۰

بات تو سچ ہے مگر.....

زرعی ٹیکس کی وصولی بڑھانے کے لیے ٹاسک فورس کا قیام

حکومت سندھ نے زرعی انکم ٹیکس کی وصولی کو بہتر بنانے کے لیے ٹاسک فورس قائم کردی ہے اور اس امید کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے ۷۰۰ ملین ☆ کا مقررہ ہدف حاصل کرلیا جائیگا۔ صوبائی سیکریٹری خزانہ نے کہا کہ پچھلے سال شعبہ زراعت کو مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہے جس کی وجہ خشک سالی اور پانی کی کمی تھی اس لیے ۷۰۰ ملین کا مقرر کردہ ہدف حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر نظر ثانی کر کے ۵۵۰ ملین روپے کردیا گیا تھا لیکن اس سال حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل دے دی ہے جو اس معاملہ پر غور کر کے ٹیکس کی وصولی میں پڑنے والے رخنہ کو دور کرے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ حکومت مصنوعی سیارے کے ذریعے زمین کا نقشہ تیار کریگی تاکہ زمین کی پیائش اور ٹیکس کا نفاذ ہوسکے۔ حکومت سندھ نے زرعی ٹیکس سے ۷۰۰ ملین روپے اکٹھا کرنے کا تخمینہ مالی سال ۲۰۰۲-۲۰۰۳ کے دوران اول تو بہتر معاشی اشاروں کے ممکنہ بہتری کے قیاس پر لگایا ہے۔ دوئم یہ کہ ٹیکس میں اضافہ ہوگا کیونکہ ۸۰ ہزار روپے سے زائد آمدنی حاصل کرنے والے تمام مالکان زمین کو ٹیکس کے دائرے میں لایا جائے گا۔

دی نیوز، ۲۲، جون ۲۰۰۲

مصنوعی کھاد کے استعمال میں کمی

کیمیائی کھاد کے استعمال میں سال ۲۰۰۱-۲۰۰۲ کے دوران ۲۶ فیصد کمی ہوئی ہے۔ مالی سال ۲۰۰۰-۲۰۰۱ کے دوران ۲،۹۶۶،۰۰۰ ٹن کیمیائی کھاد استعمال کی گئی تھی جو کہ پچھلے پانچ سال کے دورانیہ میں سب سے زیادہ تھی۔ سرکاری ذرائع نے اس ڈرامائی کمی کو آبپاشی کے پانی میں کمی سے منسوب کیا ہے لیکن کھاد کے استعمال میں کمی کرنے والا ایک بڑا عنصر کھاد کی قیمت میں گزشتہ سال کے دوران ہونے والا اضافہ ہے جیسا کہ وفاقی بیورو برائے شماریات کے جاری کردہ اعداد و شمار کے جائزے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیمیائی کھاد کی دس اقسام میں سے نو کی قیمتیں بڑھی ہیں جن میں سونا یوریا ۱۵ء۵ فیصد، کسان یوریا ۲۶ء۵ فیصد اور سی ایمونیم سلفیٹ ۹۶ء۱۳ فیصد قیمتیں ایک سال کے اندر اندر بڑھی ہیں۔ مستقل طور پر جاری خشک سالی اور کھاد کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے کسانوں کی کھاد کے استعمال میں کمی واقع ہوئی ہے۔

ڈان، ۲، جولائی ۲۰۰۲

کھاد پر جی ایس ٹی کی وجہ سے کسانوں کو کھاد کی خریداری پر اءا بلین روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔

سندھ آبادگار بورڈ نے کہا ہے کہ کسان حکومت کی کمائی میں اس سال صرف کھاد پر جنرل سیلز ٹیکس (جی ایس ٹی) کے نفاذ کی وجہ سے اءا بلین☆ جمع کرائیں گے۔ اجلاس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ حکومت ۳۱ مارچ ۲۰۰۳ تک تمام قرضوں اور سود کی رقم کو معاف کردے۔ اجلاس میں صوبائی بجٹ ۲۰۰۲-۲۰۰۳ میں ۵ء۱ بلین روپے کے زرعی آمدنی پر ٹیکس کے نفاذ پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس میں کہا گیا کہ زرعی شعبہ ٹیکسوں کا مزید بوجھ نہیں سہار سکتا۔ شعبہ زراعت پر اضافی ۸ بلین روپے، جائیداد ٹیکس، ۱۵ء بلین روپے روڈ ٹیکس کے علاوہ ۳ء۷ بلین روپے ریفائنڈ شوگر پر لاگو کیے گئے ہیں۔ بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ ان محصولات کے علاوہ ڈیزل، بجلی اور ٹریکٹر، کھیتی باڑی کے اوزار اور کیڑے مار ادویات پر جی ایس ٹی اور سرچارج ''اور پھر بیج، کھاد اور کیڑے مار ادویات کے ساتھ ساتھ دوسرے خدمات اور بینک کے سود جیسے بالواسطہ ٹیکس دیگر اخراجات میں شامل ہیں''۔

دی نیوز، ۸، جولائی ۲۰۰۲

عالمی مالیاتی اداروں کا شروع سے اصرار رہا ہے کہ زرعی شعبہ سمیت دیگر شعبوں سے ٹیکسوں کی وصولی کو ہر طریقے سے ممکن بنایا جائے۔ اسی لیے حکومت سندھ نے زرعی ٹیکس کی وصولی کے لیے ٹاسک فورس تشکیل دی ہے۔ ملک میں برسات کے موسم کے دوران بھی پانی کی صورتحال غیر یقینی ہے اور ٹیوب ویلوں سے بھی پانی کے حصول کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اس صورتحال میں کسانوں پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھانا اور اس کے لیے حیلے بہانے تلاش کرنا انتہائی افسوس ناک اور قابل مذمت ہے۔

حکومت نے کاٹن پالیسی کا اعلان کردیا ہے

حکومت پاکستان نے کپاس کی قیمت بڑھادی ہے۔ ٹیوب ویلوں سے پانی کے اخراج میں ۲۵ سے ۵۰ فیصد کمی آگئی ہے جس کی وجہ سے کپاس کے لیے زیر کاشت رقبے میں کمی کردی گئی ہے۔ حکومت کی اعلان کردہ نئی کاٹن پالیسی میں کپاس کی قیمت جو پہلے ۷۸۰ روپے فی ۴۰ کلوگرام تھی بڑھا کر ۸۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔ وزیر تجارت نے کہا کہ اگر کپاس کی قیمت ۸۰۰ روپے فی چالیس کلوگرام سے کم ہوئی تو ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (ٹی سی پی) کاشتکاروں سے سو فیصد کپاس خریدے گی۔ سیکریٹری زراعت نے کہا کہ دنیا میں کاٹن کی پیداوار کا تخمینہ ۷ ملین گانٹھ کم لگایا گیا ہے جس کے باعث عالمی سطح پر کپاس کی قیمت ۴۴ سے بڑھ کر ۵۳ سینٹ فی یونٹ تک جانے کا امکان ہے۔

کپاس کی آزادانہ درآمد و برآمد برقرار رہے گی، مزید یہ کہ پاکستان میں کپاس کی قیمت ۸۵۰ سو روپے سے شائد نیچے نہ آئے اور ٹی سی پی کو کپاس بالکل خریدنی نہ پڑے۔

جنگ، ۱۳، جون ۲۰۰۲

وزارت تجارت کا کہنا ہے کہ وہ کپاس کی قیمت ۸۰۰ روپے فی ۴۰ کیلوگرام سے نیچے گرنے نہیں دے گی اور اگر ایسا ہوا تو ٹی سی پی مداخلت کریگی اور حکومت کے مقرر کردہ کم سے کم نرخ پر کپاس خریدنا شروع کر دیگی۔ کاشتکاروں نے اس عمل کے کارگر ہونے پر شبے کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اندیشوں کو پچھلے سال ٹی سی پی کے رویے سے تقویت پہنچی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر حکومت واقعی بیان کیے گئے فیصلے کے بارے میں سنجیدہ ہے تو ٹی سی پی کو پہلے سے رقم دے دے تا کہ ٹی سی پی درکار فنڈز کی عدم دستیابی کا شکار نہ ہو۔

دی نیوز، ۱۱، جولائی ۲۰۰۲

کپاس کی امدادی قیمت پر ناپسندیدگی کا اظہار

ایک سروے کے مطابق وزارت تجارت کی طرف سے کپاس کی امدادی قیمت پر کاشتکاروں اور دیگر حلقوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ یہ قیمت اس سال کپاس کی قیمت میں بین الاقوامی طور پر متوقع ہونے والے اضافہ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ کپاس اور دیگر فصلوں کے قیمت خرید کا اعلان وفاقی وزارت خوراک وزراعت اور مال مویشی کیا کرتے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ اس سال کپاس کی کم سے کم قیمت کا اعلان وفاقی وزیر تجارت نے کیا۔ سندھ آباد گار بورڈ نے ان اطلاعات کے باوجود کہ اس وقت پوری دنیا میں امریکہ، چین اور بھارتی گجرات میں مختلف وجوہات کی بناء پر کپاس کی فصل بری طرح متاثر ہوئی، کم امدادی قیمت کے تعین پر تنقید کی ہے۔ یہ امید کی جا رہی تھی کہ اس سال ۴۰ کلوگرام کپاس کی قیمت ۹۰۰ روپے مقرر کی جائیگی لیکن اعلان ۸۰۰ روپے کا ہوا جو کہ گزشتہ سال سے صرف ۲۰ روپے زیادہ ہے۔ کپاس کی ملکی اور غیر ملکی قیمت کے درمیان فرق کا فائدہ برآمد کنندگان اور ٹیکسٹائل کارخانوں کے مالکان کو پہنچے گا جبکہ کاشتکاروں کو نقصان برداشت کرنا پڑیگا۔

دی نیوز، ۱۱، جولائی ۲۰۰۲

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کپاس کی کاشت

وفاقی حکومت نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کپاس کی پیداوار بڑھانے کے لیے ۹٫۸ ملین روپے کی منظوری دی ہے۔ حکومتی ذرائع کے مطابق اس سلسلے میں وزارت خوراک وزراعت نے ایک منصوبے کا آغاز کیا ہے جس کا مقصد ان دو صوبوں میں کپاس کی کاشت کے لیے نئے علاقوں کا پتہ چلانا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت بلوچستان میں ۵۰ ہزار اور صوبہ سرحد میں ۳۰ ہزار ایکڑ زمین کپاس کے لیے مختص کی جائے گی۔ کاشتکاروں کو بیج کی خریداری کے لیے آسان شرائط پر قرضہ فراہم کیا جائے گا اور کپاس کے بیج کی ایک تہائی مقداران کو حکومتی شعبے جات فراہم کریں گے۔ ڈان، ۵، جون ۲۰۰۲

صوبہ سرحد میں تمباکو پہلے ہی صحت اور ماحولیات کی وجہ سے کافی نقصاندہ تصور کیا جاتا ہے، کپاس کی فصل مزید آلودگی کا ذریعہ بنے گی۔ ان اقدامات سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت آئندہ بھی کسانوں کے مسائل حل کرنے کے بجائے ان کے لیے مشکلات پیدا کرنے والے اقدامات پر کاربند رہے گی۔ نتیجتاً عوامی صحت، تحفظ خوراک اور ماحول کے مسائل مزید گھمبیر ہو جائیں گے۔

کپاس کی پیداوار سال ۲۰۰۱ میں متاثر ہوئی

صوبہ پنجاب کے سیکرٹری زراعت نے سال ۲۰۰۱ کو صوبہ پنجاب میں کپاس کی فصل کے حوالے سے تباہ کن قرار دیا ہے کیونکہ اس دوران زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے درکار زیادہ تر عوامل کپاس کی فصل کے لیے منفی رہے۔ انہوں نے کہا کہ فصل کے زیر کاشت رقبہ اور فی ایکڑ پیداوار دونوں میں گزشتہ تین سال سے مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ اس تمام عرصہ میں موسم موافق نہیں رہا اور مئی اور جون کے بارشوں نے کسانوں کو دوبارہ فصل اگانے پر مجبور کیا۔

۲۰۰۱ میں کپاس کی فصل پر کیڑوں نے بڑے زبردست حملے کیے۔ اس عرصہ کے دوران جاسیڈ سنڈی، امریکن سنڈی اور گلابی سنڈی فصل پر حملہ آور ہوئے۔ اتنی بڑی تعداد میں سنڈیوں کا حملہ کئی سالوں کے بعد پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ نتیجتاً کیڑے مار ادویات کا استعمال دگنا ہو گیا ہے اور کسانوں کو اضافی مالی بوجھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ کیڑے مار ادویات بڑی مقدار میں ملاوٹ ہونے کی وجہ سے غیر موثر رہیں اور کپاس کی پیداوار مزید متاثر ہوئی۔ ٹی سی پی کے مارکیٹ سے ایک ملین کپاس کی گانٹھیں خریدنے میں ناکامی نے جلتی پر تیل کا کام کیا جس نے کپاس کی نرخوں پر دباؤ کو بڑھایا۔ انہوں نے بتایا کہ کپاس کی درآمد نے مقامی کاشتکاروں کے لیے مشکلات پیدا کیں۔

دی نیوز، ۶، جون ۲۰۰۲

حکومت عالمی مالیاتی اداروں کے زیر اثر ایک طرف ٹیکس اور محصولات میں روز افزوں اضافہ کر رہی ہے تو دوسری طرف زرمبادلہ کے حصول کی خاطر ملک میں نقد آور فصلوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ یہ اقدامات ملک بھر سے کپاس کی پیداواری مسائل کے حوالے سے شدید شکایات آنے کے باوجود کیے جا رہے ہیں۔

☆ ایک ملین = دس لاکھ = ۱,۰۰۰,۰۰۰

ایک بلین = ایک ارب = ۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰

قارئین سے

چیلنج کے بارے میں آپ کی تنقید، آراء اور تجاویز کو خوش آمدید کہا جائے گا

رخ زمانہ.....

زرعی تجارت کے حوالے سے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں امریکہ کی نئی تجویز

امریکہ نے زرعی تجارت کے حوالے سے ایک تجویز پیش کی ہے۔اس تجویز میں کہا گیا ہے کہ تمام ممبر ممالک زراعت کے حوالے سے دی جانے والی مراعات میں کمی کرنے کے علاوہ بازار میں مقابلہ کے رجحان کو فروغ دیں تاکہ زرعی پیداوار کی خرید وفروخت میں مزید تیزی پیدا کی جاسکے۔

امریکہ نے تجویز کی ہے کہ یہ عمل دو مراحل میں پانچ سال کے عرصہ کے دوران مکمل کیا جائے۔ پہلے مرحلہ میں برآمدی مراعات کا مکمل خاتمہ اور برآمدی محصولات میں کمی جبکہ دوسرے مرحلہ میں برآمدی محصولات کا مکمل خاتمہ اور تجارت کی راہ میں حائل تمام مراعات کا خاتمہ شامل ہے۔

۳۰، جولائی ۲۰۰۲ (ag-impact@iatp.org)

کمشنر یورپی یونین کی تجویز سخت تنقید کی زد میں

ایک خبر کے مطابق یورپی یونین کے مختلف وزراء زراعت نے کمشنر یورپی کمیشن کی اس تجویز کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس میں کسانوں کو دی جانے والے مراعات کو ۳ فیصد تک کم کرنے اور فی کسان مراعات کو سالانہ تین لاکھ یورو (ایک کروڑ ۶۸ لاکھ روپے) تک محدود کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ فرانس کے ایک یونین لیڈر کے مطابق اگر مراعات میں تجویز کردہ کمی پر عمل درآمد کیا گیا تو اس سے فرانس میں ۱۰ سال کے اندر، زراعت سے وابستہ دو لاکھ کسان اپنے پیشہ سے محروم ہو جائیں گے۔

۱۹، جولائی ۲۰۰۲ (ag-impact@iatp.org)

ایک طرف امریکہ اور یورپی یونین دیگر ممالک سے برآمدی محصولات اور مقامی مراعات کے خاتمے کی تجاویز پیش کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف امریکی حکومت نے پچھلے چند ماہ میں ۱۸۰ ارب ڈالرز کا ''فارم بل'' منظور کیا ہے، جس میں کسانوں کو تاریخی مراعات دی گئی ہیں جبکہ دوسری طرف یورپی یونین کے وزرائے تجارت کسانوں کو دی جانے والی مراعات میں صرف ۳ فیصد کمی کی مخالفت کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپی یونین تیسری دنیا کے زرعی ممالک میں پیدا ہونے والی زرعی پیداوار کو نہ صرف اپنی منڈیوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان ممالک کی منڈیوں پر خود قابض ہونا چاہتے ہیں۔

اب یہ کوئی راز نہیں رہا کہ ترقی یافتہ دنیا کے ممالک اپنے تجارتی مفادات کی خاطر دنیا بھر میں بھوک وافلاس میں مبتلا لوگوں کی زندگیوں کو داؤ پر لگانے میں کبھی بھی پس وپیش نہیں کرتے اور ظاہری طور پر دنیا میں غربت کی کمی کا کھوکھلا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

ڈبلیو ٹی او کے معاہدوں کی آڑ لے کر تیسری دنیا کے ممالک کی منڈیوں تک رسائی کو ممکن بنایا جا رہا ہے، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ذریعے کسانوں کو ہر قسم کی مراعات سے محروم کیا جا رہا ہے اور زراعت میں استعمال ہونے والی مختلف اشیاء مثلاً بیج، تیل، کھاد اور کیڑے مار ادویات پر ٹیکس لگا کر ان کی پیداواری لاگت میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جس سے وہ بین الاقوامی کمپنیوں کی زرعی درآمدی یلغار کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔

پانی کی نجکاری کے خلاف احتجاج اور ناکہ بندی

۲۳، جولائی ۲۰۰۲ کو میشیگن، امریکہ میں پانی کی نجکاری کے خلاف سرگرم افراد نے سخت احتجاج کرتے ہوئے پانی کے بوتلوں کی ترسیل میں رکاوٹ ڈالنے کی خاطر سڑک کو ۷ گھنٹہ تک آمدورفت کے لیے بند کر دیا۔ پانی کو بوتل میں بند کر کے فروخت کرنے کی خاطر یہ کارخانہ مئی ۲۰۰۲ میں نیسلے کمپنی کے ایک ذیلی ادارے نے قائم کیا تھا۔ منصوبہ کے مطابق اس نئے کارخانہ سے سالانہ ۱۰ کروڑ بوتل پانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مظاہرین نے اس منصوبہ کو دنیا میں موجود پانی کے قدرتی ذرائع پر نجی اداروں کے قبضے اور پانی پر عوام کی مشترکہ ملکیت کے خلاف اقدام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ احتجاج شہریوں کی طرف سے ریاستی پانی پر ایک نجی ادارے کی طرف سے قبضہ کرنے کے سلسلے میں ہونے والے مظاہروں کی ایک کڑی ہے۔

ڈیورس ویمن فار ڈیورسٹی لسٹ سرونٹ، ۲۹، جولائی ۲۰۰۲ (divwomen@vsnl.com)

نائیجیریا میں آئل کمپنی کے خلاف خواتین کی مزاحمتی تحریک

تقریباً ۲ ہزار خواتین نے کیورون ٹیکسیکو نامی امریکی آئل کمپنی کے خلاف نائیجیریا میں احتجاج کیا۔ خواتین نے ہیلی پیڈ اور ہوائی راستے بند کر دیے۔ نائیجر ڈیلٹا ایک اور آئل کمپنی کے ملازمین بھی احتجاج میں شامل ہوئے۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ بین الاقوامی کمپنیاں اس علاقے سے لاکھوں ڈالرز کا منافع تو حاصل کر رہی ہیں لیکن اس علاقے کے باشندے غربت اور ماحولیاتی آلودگی کے دائرے سے نہیں نکل پائے ہیں۔ مظاہرین نے مختلف سہولتوں اور معاش کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس علاقے میں نہ تو سڑکیں، نہ بجلی اور نہ ہی گیس موجود ہے، حالانکہ امریکی کمپنی کے آفس میں تمام سہولتیں ہیں۔

۱۶، جولائی ۲۰۰۲ (amarsanaa@apwld.org)

پانی اور تیل آج کی جدید دنیا کی اہم ترین ضروریات ہیں۔ان وجوہات کی بناء پر دنیا بھر کی بین الاقوامی کمپنیاں ان ''اشیاء'' کی تجارت میں دلچسپی رکھتی ہیں۔تیل کی تلاش، نکاس اور تجارت پر بین الاقوامی کمپنیوں کا پہلے ہی قبضہ مستحکم ہو چکا ہے۔اس قبضہ کے نتیجے میں ایک طرف مقامی آبادی اور ماحول کو بے پناہ نقصان پہنچ رہا ہے تو دوسری طرف دنیا بھر کے عوام کو توانائی کا یہ اہم ذریعہ مہنگے داموں فروخت کیا جا رہا ہے جبکہ فائدہ صرف تیل کی تلاش، ترسیل اور تجارت سے وابستہ کمپنیوں کو ہے۔

بڑھتی ہوئی آلودگی کے باعث پانی کے ذخائر مثلاً تالاب، جھیل، دریا، گلیشیئر اور سمندر آلودہ ہونے کے علاوہ موسمی تغیرات نے پانی کے ''کاروبار'' کو منافع بخش بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔۱۹۸۰ کی دہائی سے آزاد تجارتی نظریہ پانی اور تیل پر بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ پاکستان سمیت ہر ملک میں پانی اور تیل کے اداروں کو ریاستی کنٹرول سے نکال کر نجی اداروں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔جس پر دنیا بھر سے احتجاج کی آواز آ رہی ہے۔تیل کے مقابلے میں پانی کی نجکاری ایک بہت حساس معاملہ ہے کیونکہ یہ ایک بنیادی انسانی حق اور ضرورت ہے۔

عالمی سطح پر ہونے والے ان احتجاجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام پانی جیسے بنیادی حق پر منافع کی خاطر کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کے قبضہ کی راہ روکنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔پانی اور تیل کی نجکاری کے منصوبے ریاستوں پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی طرف سے عائد کردہ شرائط کا حصہ ہیں۔ہمارے ملک میں بھی پاکستان اسٹیٹ آئل (پی ایس او) کی نجکاری کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔زرعی شعبہ اور شہریوں کے لیے پانی کی نجکاری کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ پانی اور تیل کے کاروبار سے وابستہ بین الاقوامی کمپنیاں مثلاً شیل، کال ٹیکس اور پانی کے کاروبار میں دلچسپی رکھنے والی کارپوریشن نیسلے پہلے ہی ملک میں موجود ہیں۔ان کمپنیوں کے لیے راہ ہموار کرنے والے ادارے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک اور ان کے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانے والی ریاستی مشینری موجود ہے۔

بالی، انڈونیشیاء میں ڈبلیو ایس ایس ڈی کی میٹنگ

عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ڈبلیو ایس ایس ڈی) کے تیاریوں کی سلسلے کی چوتھی کانفرنس، پریپ کام IV کا انعقاد انڈونیشیاء کے شہر بالی میں ۲۷ مئی تا ۷ جون کو ہوا۔ جہانسبرگ کی کانفرنس سے پہلے یہ آخری کانفرنس تھی۔عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی جنوبی افریقہ کے شہر جہانسبرگ میں ۲۴، اگست تا ۴، ستمبر ۲۰۰۲ منعقد ہو رہی ہے۔ کانفرنس میں مندرجہ ذیل امور زیر غور لائے جائیں گے۔

۱۔ عملی مسودے پر بات چیت

۲۔ متعدد امور میں دلچسپی رکھنے والوں کے درمیان تبادلہ خیال

۳۔ شراکتی بات چیت

۴۔ وزارتی سطح پر سیاسی اعلامیہ کی تیاری

عملی مسودہ ''بالی پلان آف ایکشن'' آئندہ ۱۰ سالوں کے لیے ایجنڈا ۲۱ کی روشنی میں اور پائیدار ترقی کے حوالے سے مختلف تسلیم شدہ مسودوں کی روشنی میں ترتیب دی جائے گی۔

سیاسی اعلامیہ وہ مسودہ ہوگا جس پر سربراہان مملکت جہانسبرگ میں دستخط کریں گے۔بالی کانفرنس میں ڈبلیو ایس ایس ڈی تیاری کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر ایمل سلیم کے تیار کردہ مسودہ جسے ''چیئرمین کا تیار کردہ بات چیت'' کا مسودہ بھی کہا جاتا ہے، پر سخت تنقید کی گئی اور جہانسبرگ کانفرنس کو ریوپلس ۱۰ کے بجائے ریو مائینس ۱۰ کا نام دینے کی تجویز بھی دی گئی جس کا مطلب ریو کانفرنس کے بعد پائیدار ترقی کے لیے تجویز کردہ اقدامات کی تکمیل کی طرف قدم آگے بڑھانے کے بجائے تنزلی کی جانب گامزن ہونا ہے۔ناقدین کا خیال ہے کہ اس مسودہ کو پائیدار ترقی کی راہ تلاش کرنے کے بجائے دنیا کی بڑی بڑی صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جہانسبرگ کی تمام تیاریوں کا رخ بھی ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے معاہدوں کے عمل درآمد کے حوالے سے ہے۔

کانفرنس کے موقع پر انڈونیشین عوامی فورم نے ایک عوامی مجلس (پیپلز فورم) کا اہتمام بھی کیا جس کا مقصد پریپ کام کے مسودے کے لیے مفید اور پائیدار تجاویز حاصل کرنا تھی۔مجلس کے شرکاء میں مقامی، علاقائی اور مالی اداروں سے تعلق رکھنے والے سول سوسائٹی کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا۔

عوامی مجلس کے نمائندوں نے ڈبلیو ایس ایس ڈی کے لائحہ عمل اور اس کے طریقہ کار پر سخت تنقید کرتے ہوئے مزاحمتی تحریک کی ضرورت پر زور دیا۔انہوں نے مطالبہ کیا:

- خوراک پر عوامی حق خودارادیت جس کے معنیٰ ایک ایسا حق ہے جس کے تحت عوام کو خود ہی خوراک و زراعت کے متعلق پالیسیاں بنانے کا اختیار حاصل ہو، ترقی یافتہ ممالک سے تیسری دنیا میں سستے اناج کی درآمدی یلغار کا خاتمہ ہو، پالیسی سازی میں کسانوں، چھوٹے کاشتکاروں سے مشورے ہوں۔
- زراعت پر کمپنیوں کی اجارہ داری بڑھانے والے اقدامات کا خاتمہ اور پیداواری وسائل تک عام لوگوں کی رسائی کی ضمانت۔
- عالمی بینک کی پالیسی کے تحت منڈی کو وسعت دینے کی خاطر کیے گئے اصلاحات کو مسترد کرنا اور حقیقی زرعی اصلاحات کا نفاذ۔
- زرعی منڈیوں میں مناسب قیمتوں کا حصول۔
- مال مویشی اور زراعت کی صنعتی بنیادوں پر ترقی کی حوصلہ شکنی۔
- ریاست کی طرف سے کسان کے حق کی حفاظت، زراعت سے ڈبلیو ٹی او کا اخراج۔

ہوشیار.....مضر صحت سویابین تیل کی امریکہ سے درآمد

جینیاتی بیج اوراس سے تیارشدہ مصنوعات کے خلاف دنیا بھر میں سائنسدان، محققین، صحت، ماحولیات اور کسانوں کے اداروں کے علاوہ سماجی اور سیاسی تنظیمیں جدوجہد کررہی ہیں۔اس کاروبار سے ترقی یافتہ ممالک کی بڑی بڑی کمپنیاں منسلک ہیں، جس کی وجہ سے انسانی صحت اور ماحول کے لیے مضر جینیاتی فصلیں اوران سے تیارکردہ مصنوعات امریکہ اور دیگر ممالک میں بڑے پیمانے پر تیاراور برآمد کی جاتی ہیں۔ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (ٹی سی پی) نے دس ہزارٹن سویابین سے حاصل شدہ کھانے کے تیل کی فروخت کے لیے ٹینڈر طلب کیے ہیں۔یہ تیل حال ہی میں امریکہ نے پاکستان کوایک خوراک مدد پروگرام ۴۱۶ (بی) کے تحت دیا ہے۔جینیاتی طور پر کاشت کیے گئے سویابین سے تیارکردہ تیل کے بارے میں خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انسانی صحت کے لیے مضر ہوسکتا ہے۔امریکہ میں جینیاتی طور پر کاشت کی ہوئی فصلیں کثرت سے پیدا کی جاتی ہیں، اس لیے امریکہ دنیا بھر میں امداد کے طور پر جو بھی خوراک فراہم کررہا ہے اس کے بارے میں شکوک وشبہات بڑھ گئے ہیں۔

حکومت پاکستان کے امریکہ سے سویابین تیل کی درآمد اوراس کے مضراثرات کے خلاف زرعی پالیسی ریسرچ اور آگہی مرکز حیدرآباد نے ۷، جولائی ۲۰۰۲ کو سیکریٹری زراعت، حکومت پاکستان کوایک خط لکھا جس میں امریکہ سے درآمد کیے جانے والے سویابین کے بارے میں کئی خدشات کا ذکر کیا گیا ہے جس میں سے ایک اس تیل کے خلاف عالمی سطح پر صحت کے حوالے سے پائے جانے والے شکوک وشبہات ہیں۔یہاں ہم اس خط کا خلاصہ پیش کررہے ہیں۔

شعبہ تجزیاتی بائیوکیمسٹری، میکووائرے یونیورسٹی سڈنی کے ڈاکٹر ڈینل جارڈن کے مطابق امریکہ میں تیار کی جانے والے زیادہ تر سویابین تیل کے لیے جینیاتی طور پر کاشت کی جانے والی اور غیر جینیاتی سویابین کو علیحدہ نہیں کیا جاتا ہے۔اس بات کی تصدیق بین الاقوامی زرعی کمپنی مونسانٹو اور جینیٹک-آئی ڈی امریکہ بھی کرچکا ہے۔اس بات کا خدشہ ہے کہ امریکہ سے درآمد شدہ سویابین تیل جینیاتی طور پر تیارکردہ فصل کی پیداوار ہے جس پر ''کھانے کا تیل'' تو تحریر ہے لیکن اس پر ''جی ایم پیداوار'' یعنی ''جینیاتی تبدیلی کے ساتھ کی گئی پیداوار'' کی نشاندہی کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی ہے۔یہ کہا جاتا ہے کہ جی ایم اوز غیر مناسب اور نامعلوم پروٹین پر مشتمل ہوتے ہیں جس کے انسانی صحت پر ناموافق (الرجک) اثرات ممکن ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جی ایم اوز کے خلاف یورپ میں بڑی مہم چلائی جارہی ہے جہاں امریکہ سے آنے والی سویابین کی منتقلی روک دی گئی ہے۔

جینیاتی طور پر تیارکردہ پیداوار کے استعمال کے خلاف جاپان، کوریا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، تھائی لینڈ، انڈیا اور برازیل میں صارفین کی طرف سے شدید مزاحمت کی جارہی ہے۔۲۱ اکتوبر ۱۹۹۹ کو یورپی یونین نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسی خوراک جس کا کوئی بھی جز ایک فیصد جی ایم اوز پر مشتمل ہو اس پر جی ایم اوز کا لیبل لگا ہونا ضروری ہے۔نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں بھی ایسا ہی ہے۔چونکہ جی ایم پیداوار سے انسانی صحت کو درپیش شدید خطرے کا امکان ہے اس لیے شمالی امریکہ سے درآمد شدہ سویابین تیل پر (پاکستان میں) اس وقت تک پابندی عائد کی جائے تاوقتیکہ اس کاروبار سے وابستہ افراد یا ادارے (درآمد و برآمد اور تقسیم کنندگان) درکار لیبل کے معیار کو حاصل نہ کرلیں۔اس معاملہ کو پاکستانی شہریوں کے صحت کو درپیش خطرے کے پیش نظر ترجیحی بنیادوں پر زیرغور لانا چاہیے۔

زرعی پالیسی ریسرچ اور آگہی مرکز حیدرآباد نے شاہدہ جمیل وزیر برائے لیبر، ماحولیات اور دیہی ترقی کو بھی ایک خط مورخہ ۳۰، جولائی ۲۰۰۲ کو تحریر کیا۔اس خط میں حکومت کی توجہ انسانی صحت اور ماحولیات پر مضر اثرات کے حوالے سے جینیاتی پیداوار اوران سے جڑے ہوئے مسائل کی طرف دلائی گئی ہے۔اس خط کے چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جینیاتی تبدیلی والی فصلیں عام فصلوں میں پائے جانے والی جینیاتی (جینز) مواد سے مختلف ہوتی ہیں۔اس لیے جینیاتی پیداوار کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فصلوں کو عام فصل نہیں سمجھا جاسکتا۔

۲۔ جینیاتی فصلوں میں موجود زہریلا مواد انسانی صحت پر سنگین اور دیرپا اثرات مرتب کرسکتا ہے۔

۳۔ ایک جرثومہ (کولی فلاور موزیک وائرس) جو کہ جینیاتی سویابین تیل میں استعمال ہوتا ہے ہیپاٹائٹس بی کے جراثیم سے مناسبت رکھتا ہے۔یہ ممکن ہے کہ پاکستان میں ہیپاٹائٹس بی کے مرض میں اضافہ امریکہ سے درآمد شدہ جینیاتی سویابین تیل کی وجہ سے ہو۔

۴۔ جینیاتی پیداوار اپنے اندر، ماحول کو متاثر کرنے اور اس میں بگاڑ پیدا کرنے کی خطرناک صلاحیت پوشیدہ رکھتی ہے۔

۵۔ کسی سائنسی تحقیق سے ابھی تک جینیاتی طور پر تیارکردہ خوراک کے انسانی صحت کو درپیش خطرات کا درست اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے۔

۶۔ حشرات کے خلاف مزاحمت کرنے والی جینیاتی فصلوں پر انتہائی زہریلی حشرات کش ادویات اسپرے کی جاتی ہیں ان جینیاتی فصلوں میں سویابین بھی شامل ہے۔

۷۔ بیکٹریا، وائرس، سور یا چوہے کے جینز پر مسلمان مذہبی بنیادوں پر اعتراض کرسکتے ہیں۔اسی طرح ہندو اور بدھ مت کے ماننے والے جانوروں کے جینز سبزیوں میں شامل

ہونے پر معترض ہو سکتے ہیں مثلاً مسلمان پیپسی کولا میں استعمال ہونے والے پیپسین کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں۔

۸۔ جینیاتی فصلیں سارے ماحولیاتی نظام کو متاثر کریں گی مثلاً

(الف) فالتو جڑی بوٹیاں کو مزید طاقتور کر دیں گی۔

(ب) دوست کیڑوں اور دیگر اجسام کو تباہ کر دیں گی۔

(ج) قدرتی جینیاتی وسعت اور سرمایہ کو متاثر کرتی ہوئی اس میں کمی کا باعث بنیں گی۔

(د) روایتی طرز کھیتی باڑی کو نقصان پہنچائیں گی

خط کے آخر میں زرعی پالیسی ریسرچ اور آگہی مرکز نے چند تجاویز پیش کی ہیں:

۱۔ جینیاتی فصلوں پر کاروباری سطح کے تحقیقاتی تجربات پر ۵ سال کے لیے پابندی عائد کی جائے اور سائنسی دنیا میں جینیاتی پیداوار پر تحقیق کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر ان کے استعمال پر بحث و مباحثہ کا اہتمام کیا جائے۔ کاروباری اداروں کی جینیاتی فصلوں پر کی گئی تحقیق کو ہی تصدیق کے لیے کافی نہ سمجھا جائے۔

۲۔ پاکستان میں کاشت کی جانے والی جینیاتی فصلیں مثلاً میر پور خاص، سانگھر اور حیدر آباد میں ہزاروں ایکڑ پر بی ٹی کپاس (جینیاتی کپاس کی ایک قسم) کو بویا جا چکا ہے، ان کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا جائے اور پاکستان سے ان کو خارج کرتے ہوئے اس کی کاشت پر پابندی عائد کی جائے۔

روایتی طریقۂ افزائش نسل بمقابلہ جینیاتی طریقۂ افزائش نسل

روایتی طریقہ افزائش نسل

(اس پر تجارتی مقاصد کے لیے حق ملکیت کا دعویٰ دائر نہیں کیا جا سکتا)

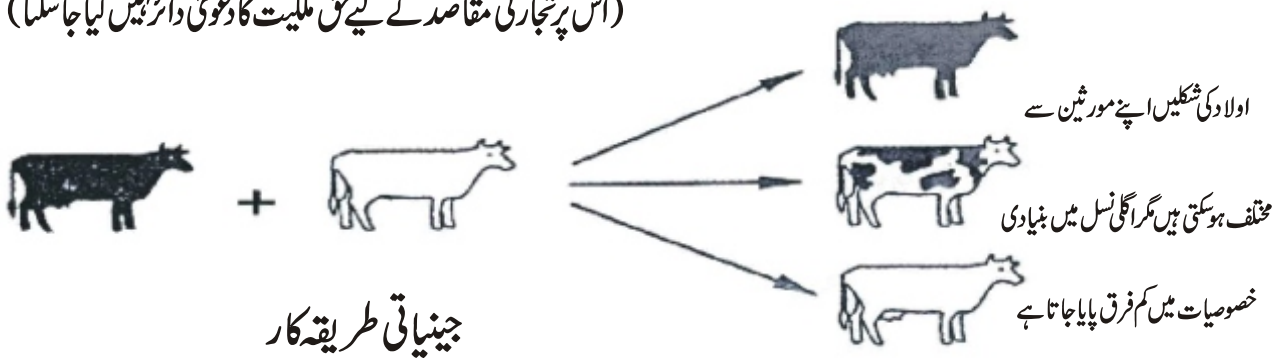

جینیاتی طریقہ کار

(جینز، پیداواری عمل اور پیداوار پر حق ملکیت کا دعویٰ دائر کیا جا سکتا ہے)

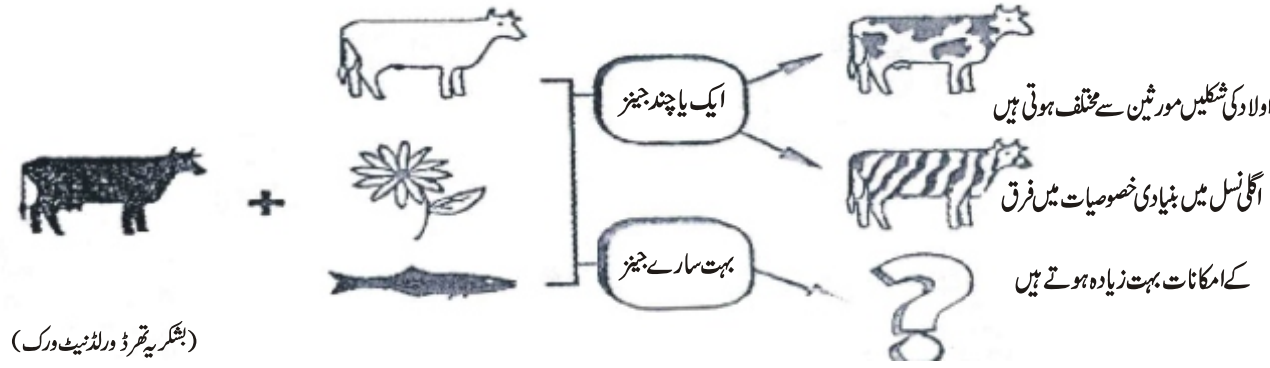

(بشکریہ تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک)